محمد علی جناح

دولت، جائیداد، وصیت

ڈاکٹر سعد خان

جُمہوری پبلیکیشنز

انتساب

میرے

بیٹے

مومن

کے

نام

21488
MAZAR-E-QUAID LIBRARY
MAZAR-E-QUAID-E-AZAM
MANAGEMENT TRUST

Independent & Progressive Books

• نام کتاب: محمد علی جناح۔ دولت، جائیداد، وصیت

• مصنف۔ ڈاکٹر سعد خان • اشاعت۔ 2020ء

• سرورق۔ مصباح سرفراز • ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

• جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

ISBN:978-969-652-177-8

قیمت 800 روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

کسی اشاعتی ادارے یا فرد کو اس کتاب کے کسی بھی حصے کو، الیکٹرانک، مکینکل، فوٹو کاپی کی شکل میں دوبارہ اشاعت کی اجازت قطعاً حاصل نہیں۔

نیز کسی بھی اشاعتی ادارے کو اس کتاب کی کمپوزنگ کو دوبارہ استعمال میں لا کر اسے شائع کرنے کا حق قطعاً حاصل نہیں۔

ایسی کسی بھی صورت میں ہمارا ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah , Daulat , Jaidad , Wasiyat

Copyright © 2020, Dr. Saad S. Khan

ALL RIGHTS RESERVED. This book contains protected material under International and Federal Copyright Laws and Treaties. Any unauthorized reprint or use of this material is prohibited. No part of this book maybe reproduced or transmitted in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording or by any information storage and retrieval system without express written permission from the publisher. The publisher does not accept any responsibility for the views and statements expressed by the author.

Find us on

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road,Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140 +92-42-36283098

Mobile: 0333-4463121

info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

فہرست

	پیش لفظ۔ عارف نظامی	7
	دیباچہ	9
باب 1	قائدِاعظم کی آمدن اور اثاثہ جات	13
باب 2	جناح منزل، بمبئی	19
باب 3	جناح منزل، دہلی	30
باب 4	جناح منزل، کراچی	37
باب 5	جناح منزل، لاہور	42
باب 6	پیپلز جناح ہال، بمبئی	48
باب 7	قائداعظم کی زرعی، کمرشل اور متفرق جائیداد	54
باب 8	قائداعظم کے بینک اکاؤنٹس اور نقد دولت	61
باب 9	قائداعظم کی صنعتی سرمایہ کاری اور سٹاک حصص	67
باب 10	قائداعظم کے آڈٹ اور ٹیکس سے متعلق امور	70
باب 11	قائدِاعظم کی جائیداد پر سفارتی تنازعات	74
باب 12	قائدِاعظم کی جائیداد پر خاندانی مقدمات	79

باب13	قائدِاعظم کا ترکہ ووراثت کے اہم سوالات	88
باب14	قائدِاعظم کی وصیت اور حل طلب معاملات	95
	اختتامیہ	101
	ضمیمہ جات: جناح خاندان کا تعمیراتی نقش پا	
ضمیمہ(الف)	مکانِ ولادت (وزیر مینشن)	107
ضمیمہ(ب)	مکانِ علالت (زیارت ریذیڈینسی)	112
ضمیمہ(ج)	مکانِ رحلت (سندھ گورنر ہاؤس)	116
ضمیمہ(د)	مکانِ وراثت (موہاٹا محل)	122
ضمیمہ(ر)	مکانِ دائمی استراحت (مزارِ قائد)	131
	حواشی برائے ضمیمہ	141
	حرفِ آخر	142
	کتابیات	150

پیش لفظ

ڈاکٹر سعد خان کی تحقیقی کتاب ''محمد علی جناح، دولت، جائیداد، وصیت'' بانی پاکستان کی دوراندیشی، رہن سہن، دنیا میں احسن اور پُروقار طریقے سے بقا کے لوازمات، رشتے نبھانے، تعلیم سے محبت اور لگاؤ کے دریچوں کو وا کرتی ہے۔ اس کتاب میں بیان کیے گئے واقعات اور ریسرچ پر مبنی ابواب اس بات کے غماز ہیں کہ قائداعظم محض ایک وکیل ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے کاروباری انسان بھی تھے جن میں جمالیاتی حس اپنی انتہا کو تھی۔

ممبئی، کراچی، لاہور، دہلی اور لندن کے پُرتعیش علاقوں میں ان کی جائیدادوں، حصص کی خریداری کا تفصیلی ذکر قاری کو اس کتاب میں مل جائے گا۔ ڈاکٹر سعد خان نے محمد علی جناحؒ کے ان اوصاف سے پردہ اٹھایا ہے جو عام آدمی کی نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ تھے۔

جناح صاحب نے جہاں ایک ذمہ دار بیٹا ہونے کا ثبوت دیا، وہاں وہ ایک انتہائی محبت کرنے والے شوہر بھی ثابت ہوئے جس کی مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ محمد علی جناح نے بیٹی سے اختلاف ہونے کے باوجود اس کے حقوق کا خاص خیال رکھا اور اپنی جائیداد سے ایک حصہ اس کے نام کر دیا۔ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں اور بہنوں سے سطحی اختلافات پر جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، قائداعظم نے عملی طور پر اس کی نفی کی ہے۔ یہی نہیں جناح صاحب نے اپنی بہنوں کو بھی اکیلا نہیں چھوڑا اور ایک بھائی

ہونے کے ناتے ان کا پورا پورا دھیان رکھا۔

بانی پاکستان کا تعلیمی اداروں کے لیے خطیر رقم چھوڑنا اس بات کی نشاندہی ہے کہ وہ مکمل ترکہ نسل در نسل منتقل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے نزدیک علم کا حصول ہر خاص و عام کے لیے ضروری تھا۔

ڈاکٹر سعد خان کی مذکورہ کتاب ان کی اَن تھک محنت کا نتیجہ ہے اور امید ہے کہ یہ کتاب تاریخ، قانون، شہریت اور سماجی علوم کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ قائداعظم سے محبت کرنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

عارف نظامی

دیباچہ

آج بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ قائدِاعظم محمد علی جناح کا شمار جنوبی ایشیا کے چوٹی کے دس امیر ترین سرمایہ کاروں میں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے خود اپنی محنت سے زندگی بنائی تھی۔ یہ اُن کی دیانت، لگن اور ذہانت تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی دولت کمانے میں کامیاب ہوئے۔ اُن کی دولت کا ذریعہ صرف قانون کا پیشہ ہی نہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کی چوٹی کی صنعتوں کے حصص اور جائیداد میں کی گئی سرمایہ کاری بھی تھی۔ محترم قائد وسیع عریض مکانات کا شوق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ایسے مکانات نہ صرف جنوبی ایشیا کے اہم شہروں، جیسا کہ ممبئی، دہلی، لاہور اور کراچی بلکہ لندن میں بھی خریدے۔ ایک مکان کو وہ رہائش کے لیے استعمال کرتے جبکہ باقی سے کرائے کی مد میں خاطر خواہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ باوجود اس حقیقت کے کہ قائد کی دولت اور جائیداد کا تجزیہ ہمیں اُن کی شخصیت کے اندر جھانکنے اور اُن کی ترجیحات کا کھوج لگانے میں مدد دیتا ہے، اس پہلو کی طرف اب تک بیشتر مؤرخین کی نظر نہیں گئی تھی۔ یہ کتاب تاریخ کے اسی خلا کو پُر کرنے کی سمت میں ایک قدم ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب آپ کی شریکِ حیات محترمہ مریم جناح نے قائدِاعظم سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا فیصلہ کیا تو محترمہ کے سامنے قائد سے شادی اور اپنے متمول باپ کی طرف سے ملنے والی بھاری دولت کے درمیان انتخاب کی

آزمائش درپیش تھی۔ تاہم مریم جناح نے محبت کو ترجیح دیتے ہوئے دولت کو ٹھکرا دیا۔ آخر میں اُنہیں پیار بھی مل گیا اور دولت بھی۔ مزید برآں، اپنے شوہر کی حاصل کردہ بے پناہ عزت وشہرت بھی ملی۔ ایسا لگتا ہے کہ شادی محمد علی جناح کو بھی راس آ گئی کیوں کہ شادی کے چند سال کے اندر اندر اُن کا شمار ملک کے دولت مند ترین افراد میں ہونے لگا۔ اس طرح شادی کے بعد بیگم صاحبہ اُس سے زیادہ خوش حال ہوگئیں جتنی وہ اپنے والد کے گھر پر تھیں۔ وہ سری نگر کی ڈل جھیل میں ایک کشتی پر بنے گھر کی تزئین وآرائش پر پچاس ہزار روپے خرچ کرنے کی استطاعت رکھتی تھیں، حالاں کہ اُنھوں نے وہاں صرف ایک ہفتہ ہی ٹھہرنا تھا۔ اس رقم میں تو کسی بھی بڑے شہر میں چار کنال کا بنگلہ خریدا جاسکتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا تذکرہ یہاں اہم ہے کیوں کہ قائد کے جائیداد میں سرمایہ کاری کے کئی ایک فیصلوں کی محرک اُن کی اہلیہ مرحومہ کی ترجیحات تھیں۔ محترمہ کی وفات کے بعد بھی قائداعظم محمد علی جناح نے انہی ترجیحات کو ملحوظِ خاطر رکھا۔

اب محمد علی جناح کی غیر منقولہ جائیداد کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس میں سے چند عمارات آج باقی نہیں ہیں کیوں کہ مکانات کی ملکیت تبدیل ہوجاتی ہے؛ پھر پرانی عمارتوں کو گرا کر مختلف مقاصد کے لیے دوبارہ تعمیر کرلیا جاتا ہے۔ موجودہ کاوش قائداعظم کے اُن چار مکانات کا جائزہ لیتی ہے جو آج بھی موجود ہیں۔ ان میں سے سب سے مشہور ممبئی میں ساؤتھ ہال کہلانے والا بنگلہ ہے۔ آج کل یہ کسی کے استعمال میں نہیں کیوں کہ اس کا مقدمہ عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ ''جناح ہاؤس''، یعنی جناح منزل کہلانے والی باقی تینوں جائیدادوں میں سے ایک آج کل دہلی میں ہالینڈ کے سفیر کی رہائش گاہ ہے؛ دوسری جناح ہاؤس میوزیم کراچی؛ اور تیسری کور کمانڈر ہاؤس لاہور ہے۔ ان جائیدادوں میں قائد کی رحلت کے بعد بھی بلواسطہ طور پر اُن کے نقش پا ہویدا تھے۔ موجودہ تصنیف ان چار شہروں میں تعمیر ان عظیم عمارتوں میں محمد علی جناح کی میراث کو تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ ایک اور عمارت جس کے بارے میں بات کریں گے وہ ممبئی میں پیپلز جناح ہال ہے جو بیگم ومحمد علی جناح کی ذاتی ملکیت تو نہیں لیکن یہ اُن کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس کتاب میں قائداعظم کی زرعی اراضی، رہائشی پلاٹ، کمرشل پلازے، کمپنیوں کے حصص میں سرمایہ کاری اور بینکوں میں موجود رقوم کی تفصیلات بھی شامل کردی گئی ہیں۔ قائداعظم کے ٹیکس، آڈٹ اور تنخواہ کے معاملات بھی روشن کردیئے گئے ہیں۔ آخر میں قائداعظم سے منسوب عمارات جیسے وزیر مینشن، زیارت ریزیڈینسی اور مزارِ قائد وغیرہ کی تاریخ بھی بطور ضمیمہ درج کردی گئی ہے۔

جب بھی ان عمارات کی بابت قائدِ محترم کی وراثت کی بات ہوتی ہے تو نظریاتی پس منظر کی جگہ آپ کی وصیت کا مسئلہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ آج کل یہ تمام غیر منقولہ جائیداد کس کے ہاتھ میں ہے اور قائد کی بقیہ منقولہ دولت کس کس کے پاس گئی ہے؟ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ قائداعظم نے اپنی وارثت کا بہت کم حصہ اپنے خاندان کے نام چھوڑا، جبکہ باقی بڑا حصہ چھے تعلیمی اداروں کے نام کردیا۔ کیا اُن کی مختص کردہ دولت اصل حقداروں تک پہنچی؟ کیا متعلقہ جامعات کو اُن کے نام کردہ رقوم ملیں؟ محمد علی جناح کے مختلف کمپنیوں میں حصص (شیئرز)، بینک کے کھاتہ جات (اکاؤنٹس) اور سکیورٹیز میں سرمایہ کاری کا کیا بنا؟ کیا اُن کے مکانات کو آج اُسی طرح استعمال کیا جارہا ہے جیسا کہ اُن کا زندگی میں خیال تھا؟ اس جائیداد نے پاک بھارت تعلقات کو کس حد تک متاثر کیا ہے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات کو اس تحقیقاتی کام کا حصہ بنایا گیا ہے۔

جناح ٹرسٹ کے ذرائع کا کہنا تھا کہ محمد علی جناح کی وصیت پر پاکستان کی جغرافیائی حدود میں من وعن عمل ہوا ہے۔ اگر یہ بات درست ہو تو بھی ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتے کہ آپ کے پانچ انسانی وارثوں میں سے چار وارث تو بھارت میں ہی رہے تھے۔ اس کے علاوہ چھے موروث اداروں میں سے بھی چار بھارت میں ہیں۔ بھارت میں موجود افراد اور اداروں کی حد تک وصیت پر کس حد تک عمل درآمد ہوا، اس کے لیے ایک اور کتاب کی ضرورت ہوگی۔ موجودہ کتاب پاکستان کی حد تک بہت سے رازوں سے پردہ اٹھاتی اور مستقبل میں تاریخ کے اس باب کے باقی پوشیدہ پہلوؤں کا کھوج لگانے کی راہ ہموار کرتی ہے۔

میں اپنے ساتھی سرکاری افسر اور ایک علم دوست شخصیت فوز خالد خان کا بے حد مشکور ہوں کہ وہ کتاب کی تدوین و ترتیب کے دوران مسلسل بہت سا مواد تلاش کرتے اور مجھے بھیجتے رہے۔ میں وجاہت مسعود صاحب اور عقیل عباس جعفری صاحب کی رہنمائی اور تعاون کا بھی ممنون ہوں، اور بالخصوص فرخ سہیل گوئندی صاحب کا جن کی حوصلہ افزائی کی بدولت کتاب میں بہت سے ابواب کا اضافہ کیا گیا۔ میں پروفیسر حمزہ ارشد صاحب کی محنت کا بھی معترف ہوں جو انہوں نے میرے انگریزی مقالہ جات کے اردو ترجمہ اور میری اردو تحریر میں نکھار پیدا کرنے کے لیے کیں۔ میں سکندر حیات صاحب کی معاونت کا بھی احسان مند ہوں جنہوں نے تحقیقی مواد جمع کرنے کے لیے بہت تگ و دو کی۔ آخر میں مَیں اپنے والدین، اہلیہ و اولاد کا بے حد شکر گزار ہوں جن کی محبت کے بغیر زندگی لاحاصل ہی رہتی۔

ڈاکٹر سعد خان

لاہور

قارئین کی آراء کے لیے:

Email: Saad.S.Khan1@gmail.com

Whatsapp No. 0302-8555073

باب 1

قائدِ اعظم کی آمدن اور اثاثہ جات

محمد علی جناح کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ پیشہ ورانہ قانونی خدمات کی فراہمی تھی۔ اُن کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے وکلا میں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ 1900ء میں پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اُن کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہانہ تھی جو کہ اُس زمانے میں بھاری تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ بہی خواہوں کی نصیحت کے باوجود اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے چھے ماہ کے اندر اندر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا کہ ایک دن وہ اتنے پیسے روزانہ کمایا کریں گے۔ وہ دن ربع صدی کے بعد اُن کی زندگی میں آ ہی گیا جب 1,500 روپے یومیہ فیس کے ساتھ اُن کا شمار ملک کے مہنگے ترین وکلا میں ہونے لگا۔

قانون کے پیشے کے علاوہ اُن کی دولت کا ایک اور اہم ذریعہ بھی تھا۔ اُنھوں نے کئی ایک شعبوں میں سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ اُن کے دوست کانجی دوارکا داس لکھتے ہیں کہ 1926ء تک محمد علی جناح کے تین کمپنیوں، بمبئی ڈائنگ، ٹاٹا سٹیل اور ٹرام وے کمپنی میں حصص کی مالیت 1.4 ملین روپے تھی۔ آج کرنسی کی قدر کے حساب سے ان کی مالیت 68 کروڑ روپے بنتی ہے۔ اُس سال سے جناح صاحب کا شمار جنوبی ایشیا کے چوٹی کے دس سرمایہ کاروں میں ہونے لگا۔ اُنہیں اس سرمایہ کاری سے چالیس ہزار روپے ماہانہ تک کی آمدنی ہو رہی تھی۔ مندرجہ بالا حصص میں سرمایہ کاری کے علاوہ اُن کے

ہندوستان میں کم از کم چار بینک اکاؤنٹس تھے: حبیب بینک لمیٹڈ دہلی؛ نیشنل بینک آف انڈیا لمیٹڈ، بمبئی برانچ؛ امپریل بینک آف انڈیا، نئی دہلی اور بمبئی برانچ اور بینک آف انڈیا، نئی دہلی برانچ۔ قیامِ پاکستان کے دنوں میں آپ نے یہ چاروں کھاتے بند کروا کر انہی بینکوں کی کراچی کی شاخوں میں اکاؤنٹ کھلوا لیے۔

اُن کی آمدنی کا تیسرا ذریعہ جائیداد تھی۔ محمد علی جناح کی مشہور ترین جائیداد ساؤتھ کورٹ کہلاتی ہے۔ اُنھوں نے یہ جائیداد 1910ء میں کرائے پر لی تھی اور پھر 1916ء میں خرید لی۔ یہ گھر اُنھوں نے 1918ء میں اپنی اہلیہ کو شادی کے تحفے کے طور پر دیا تھا۔ اس گھر میں ان دونوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے دس سال اکٹھے بسر کیے۔ اب یہ جائیداد کئی عشروں سے خالی پڑی ہے۔ ساؤتھ کورٹ اس وقت بھی پاکستان اور بھارت کے درمیان شدید تنازع کا باعث ہے۔

ایک وقت میں اُن کی ملکیت میں ہندوستان میں مختلف مقامات پر جائیدادیں تھیں جو چار اہم شہروں، بمبئی، دہلی، کراچی اور لاہور کی مہنگی ترین جگہوں پر واقع تھیں۔ آج ان چاروں میں سے ہر شہر کی آبادی ایک کروڑ سے زائد ہے۔ آخری دو کا شمار پاکستان کے بالترتیب پہلے اور دوسرے نمبر کے گنجان آباد ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ قائدِاعظم نے جو سب سے پہلی جائیداد خریدی، وہ لٹل گبز روڈ پر ایک بنگلہ تھا جہاں وہ 1918ء میں اپنی شادی سے پہلے رہا کرتے تھے۔ شادی شدہ زندگی آپ نے ساؤتھ کورٹ میں بسر کی۔ اہلیہ کے انتقال پر آپ برطانیہ منتقل ہو گئے جہاں چار سال رہے۔ یوں یہ بنگلہ 16 سال خالی پڑا رہا۔ انگلستان سے واپسی پر دوبارہ چھ سال (1934-40) کے لیے اُنھوں نے اسی مکان میں مزید رہائش اختیار کی۔ اس مکان کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں، سوائے اس کے کہ آپ نے یہ مکان 2,80,000 روپے میں اردشیر واڈیا نامی شخص سے خریدا تھا۔

لٹل گبز روڈ پر بنگلے کے ساتھ متصل ایک چار منزلہ عمارت مے فیئر فلیٹ کے نام سے جانی جاتی تھی جس میں آٹھ فلیٹس تھے، یعنی ہر منزل پر دو دو۔ 10 فروری 1938ء کو

قائداعظم نے منوچہر رستم جی بارووچہ سے 3,38,000 روپے میں بلڈنگ خرید کر فلیٹ کرائے پر چڑھا دیئے۔ زمینی منزل پہ کرایہ 375 روپے ماہانہ تک پہنچتا تھا، جو بتدریج کم ہو کر سب سے اوپر کی منزل پر ماہوار 250 روپے تھا۔ لہٰذا مے فیئر بلڈنگ سے قائداعظم کو کُل ماہانہ کرایہ 2,540 روپے ملتا تھا۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ 1940ء کی قراردادِ لاہور کے بعد محمد علی جناح نے مستقبل کے پاکستان میں جائیدادیں خریدنا شروع کر دیں۔ چنانچہ لٹل گبز والا بنگلہ اور مے فیئر فلیٹس 1943ء میں فروخت کرنے پڑے کیوں کہ اُنہیں کراچی اور لاہور میں دو وسیع و عریض کوٹھیاں خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ ان دونوں مکانات پر بالترتیب باب 4 اور 5 میں بات ہوگی۔ لٹل گبز روڈ کے مکان اور متصل مے فیئر فلیٹس 10 لاکھ روپے میں شاہ پور جی مستری نامی شخص نے خریدے اور 8 اگست 1943ء کو رجسٹری بھی اس کے نام ہو گئی۔ یعنی دونوں کا خریدار ایک ہی تھا۔

نئے مالک نے لٹل گبز روڈ والے مکان کو گرا کر اس کی جگہ بھی اپارٹمنٹ تعمیر کر دیے۔ جب قائدِاعظم کے پہلے سوانح نویس ہیکٹر بولیتھو نے 1952ء میں اس جگہ کا دورہ کیا تو اکثر علاقہ مکیں لٹل گبز روڈ والے مکان کی اصل جگہ کو جانتے اور نشاندہی کرتے تھے۔

قبل ازیں جب محمد علی جناح کو اپنی اہلیہ مریم جناح کی 1929ء میں وفات نے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا تو اگلے برس وہ اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور بیٹی دینا جناح کے ساتھ لندن چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے ہیمپسٹڈ ہیتھ میں ایک بنگلہ حاصل کیا جو ویسٹ ہیتھ ہاؤس کہلاتا تھا۔ وہ 1880ء کی دہائی میں تعمیر شدہ اس پرانے لیکن پُروقار تین منزلہ مکان میں رہنے لگے۔ اس مکان کا مشرقی حصہ ایک بلند مینار پر مشتمل تھا جو گردونواح کا شاندار نظارہ پیش کرتا تھا۔ چار سال رہائش کے بعد قائد نے یہ مکان اُس وقت فروخت کر دیا جب اُنھوں نے 1934ء میں واپس ہندوستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔

مکان میں بہت سے کمرے اور چھتر تھے۔ آٹھ ایکڑ کی چراگاہ، گاڑیوں کے

لیے ایک سڑک اور ملازمین کے لیے دربارگاہ تھی۔ آج ویسٹ ہیتھ روڈ پہ اس بنگلے کی جگہ 12 چھوٹے مکانوں نے لے لی ہے۔ مکان کے ساتھ مالکن لیڈی گراہم وڈ بھی قریب ہی رہتی تھیں۔ مکان کی قیمت خرید معلوم نہ ہوسکی لیکن ہندوستان واپسی پر یہ مکان 10,000 پاؤنڈ میں بکا تھا جو کہ اس دور کی شرح مبادلہ کی رُو سے ایک لاکھ 30 ہزار روپے بنتے ہیں۔

مذکورہ بالا چھے مکانات اور آٹھ فلیٹس کے علاوہ قائد نے ملیر کینٹ کراچی میں دو الگ سودوں میں مجموعی طور پر 120 ایکڑ زرعی اراضی خریدی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بلدیہ کراچی کی حدود میں موجود ضلع کیماڑی کے علاقے گابوپٹ میں وسیع زمین خرید کر اس پر ایک ہٹ بنوایا۔ مزید برآں، 1945ء میں لاہور کے موضع اچھرہ میں بھی زرعی اراضی خریدی جو گلبرگ سکیم کے اجرا پر اس میں شامل ہوگئی اور قائد کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کو معاوضے میں چار پلاٹ مل گئے۔ کراچی اور لاہور میں مکانات اور پلاٹس حاصل کرنے کی کوئی سیاسی، جذباتی یا کمرشل وجہ نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اُنہیں یقین تھا کہ جلد ہی پاکستان ایک حقیقت بن جائے گا چنانچہ اُنھوں نے ذاتی جائیداد نئے ملک میں بنانا شروع کردی تھی۔

محمد علی جناح کی جائیدادوں میں دلچسپی کا سب سے انوکھا پہلو اُن کی اہلیہ بیگم مریم جناح کے ساتھ اُن کی وابستگی ہے۔ مئی 1947ء میں برصغیر کے شمال میں ہمالیہ سلسلے میں وادی کلو میں دریائے بیاس کے کنارے ایک درختوں میں گھری ہوئی تفریح گاہ (جو آج کے بھارتی صوبہ ہماچل پردیش میں ہے) خریدنے کی بات چیت حتمی مراحل میں تھی لیکن سودا طے نہ ہو پایا تھا۔

اسی طرح قائد کے خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے ایک اور منفرد قسم کی جائیداد خریدنے کے لیے استفسار کیا تھا۔ یہ کشمیر میں بوٹ ہاؤس تھا، یعنی سری نگر کے باہر جھیل میں کشتی میں قائم گھر۔ ایک مرتبہ پھر اس جائیداد کی بھی کوئی سیاسی یا تجارتی اہمیت نہیں تھی؛ اور نہ ہی محمد علی جناح بلند و بالا پہاڑوں اور بہتے ہوئے پانیوں کے اتنے شائق

تھے۔ ان فیصلوں کی کوئی ٹھوس وجہ نہیں سوائے اس کے کہ مرحومہ بیگم صاحبہ پہاڑی علاقوں کو ترجیح دیتی تھیں۔ یہی حقیقت قائد کے ذہن کے نہاں خانوں میں حاوی رہی ہوگی۔

وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا 3 جون 1947ء کے منصوبہ کا اچانک اعلان ایک دھماکے سے کم نہ تھا جب برطانوی حکومت نے یک طرفہ طور پر آزادی اور انتقالِ اقتدار کی تاریخ ایک سال پہلے کر ڈالی۔ اس کی وجہ سے محمد علی جناح کو جائیداد سے متعلق ان تمام منصوبوں کو سرد خانے میں ڈالتے ہوئے نوزائیدہ ریاست کی تعمیر پر توجہ دینی پڑی۔ اگلے ماہ 18 جولائی 1947ء کو پاکستان کی عارضی حکومت دہلی میں قائم ہوئی اور چھبیس دن بعد یعنی یوم آزادی 14 اگست کو اسے کراچی منتقل کیا گیا۔

1947ء میں پہاڑی مقامات پر کیے جارہے جائیداد کے مذکورہ بالا سودوں میں کوئی بھی محمد علی جناح کی زندگی میں پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا تھا کیوں کہ آپ اگلے برس اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ لیکن کراچی شہر میں دو کمرشل پلازے (محمدی بلڈنگ اور مہتہ بلڈنگ) آپ نے ضرور خریدے۔ ان مہنگی جائیدادوں کو خریدنے کے لیے کی جانی والی بات چیت سے اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ قائد کے پاس نقد دولت کی کمی نہ تھی، جیسا کہ اُوپر بتائے گئے اُن کے بینک کھاتوں کے ذکر سے پتہ چلتا ہے۔ تاہم قائد اپنی وفات کے بعد جائیداد اور نقد رقم کی تقسیم کا معاملہ زندگی میں ہی طے کر گئے تھے۔ درحقیقت اُنھوں نے 1939ء میں اپنی وصیت پر دستخط کردیے تھے اور اپنی زندگی کے باقی نو برسوں کے دوران اُنھوں نے اپنی وصیت کبھی تبدیل نہیں کی تھی۔ تاہم یہ وصیت اُن کی زندگی میں خفیہ رکھی گئی اور اُن کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔

قائد کے سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو کا اندازہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت قائد کی سرمایہ کاری اور جائیداد کا حجم چھے سے سات ملین روپے (1948ء کے ایکس چینج ریٹ کے مطابق بیس لاکھ ڈالر) تھے جبکہ مشہور دانشور اقبال احمد کے نزدیک یہ حجم دس ملین روپے (1948ء کے زرِمبادلہ کے نرخوں کے مطابق 34 لاکھ امریکی ڈالر) تھا۔ اگر کسی جائیداد کی قیمت نہ بھی بڑھتی تو صرف شرح مبادلہ میں اضافے اور 70 سال کی افراطِ زر

کے مطابق آج محمد علی جناح کی دولت چار سے سات ارب روپے (2020ء کے غیر ملکی کرنسی کی شرح تبادلہ کے مطابق اڑھائی سے چار کروڑ امریکی ڈالر) ہوتی۔ تاہم آبادی کے بڑھنے سے برصغیر میں تمام جائیداد کی قیمت آسمان کو چھونے لگی ہے۔ اس نے عام مہنگائی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ محمد علی جناح کے چاروں مکانات، جن میں سے ہر ایک مندرجہ بالا الگ شہر میں واقع ہے، کی 2020ء میں کمرشل قدر 1.4 سے لے کر 1.6 ارب ڈالر کے درمیان ہوسکتی ہے۔ اسے 170 روپے فی ڈالر کے حساب سے ضرب دیں تو اگر آج تک قائد کی زندگی وفا کرتی تو ان کے اثاثہ جات کی قیمت دو سے تین کھرب روپے بنتی۔

باب 2

جناح منزل، بمبئی

3۔ ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ، ممبئی، بھارت

(المعروف ''ساؤتھ کورٹ'')

''ساؤتھ کورٹ'' کہلانے والا اور گوا یعنی پرتگالی طرز کا بنا ہوا یہ مکان شروع میں سروکٹر ساسون نامی کسی شخص کی ملکیت تھا۔ 15,467 مربع گز (تین ایکڑ سے زائد) وسیع و عریض رقبہ پر محیط اس بنگلے سے بحیرۂ عرب کا شاندار منظر دکھائی دیتا تھا۔ محمد علی جناح کے اسے کرائے پر لینے اور پھر خریدنے سے پہلے بھی اس میں زیادہ تر انگریز سرکاری افسر کرائے پر رہتے رہے تھے۔

انگریز دور میں ایک ڈپٹی کمشنر نے ساحل سمندر پر یہ پلاٹ 6 مئی 1842ء کو الاٹ کیا اور الاٹی نے دسمبر 1844ء میں تعمیر مکمل کر کے گھر میں رہائش اختیار کر لی۔ کئی کرایہ داروں اور دو مرتبہ فروخت کے بعد آخر کار 30 جولائی 1883ء کو سر آدم جی پیر بھائی ابراہیم کی ملکیت میں آیا جو تیسرے خریدار تھے۔ وہ اور ان کا خاندان 20 سال سے زائد عرصے یہاں مقیم رہے اور پھر نیا مکان بنانے کے بعد اس کو کرایے پر دے دیا۔

قائد سے پہلے سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک سرکاری افسر جسٹس رینڈے تھے جو اس عمارت میں 1910ء کے آس پاس تک مقیم رہے۔ جس سال وہ رخصت ہوئے تو

قائد یہاں کے نئے کرایہ دار بنے۔ اسے لینے کا بنیادی مقصد کولابا کے پہلی منزل والے اپارٹمنٹ جہاں قائد رہائش پذیر تھے، سے نجات حاصل کرنا تھا کیوں کہ آپ اس علاقے کے شور وغل سے بہت تنگ تھے۔ چھے سال بعد جب یہ پتہ چلا کہ اس جائیداد کے موجودہ مالک (یعنی سر آدم جی پیر بھائی ابراہیم مرحوم کے صاحبزادے) اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں تو اواخر 1916ء میں محمد علی جناح نے اُن سے قیمت پر بات چیت کر کے 1,25,000 روپے میں سودا طے کرلیا۔ چند ماہ میں مکمل ادائیگی کے بعد یعنی 16 اپریل 1917ء کو محمد علی جناح کے نام مکان کی رجسٹری ہوئی تو ساتھ ہی اُن کا نام بلدیہ کے ریکارڈز میں ساؤتھ کورٹ کے مالک کے طور پر درج ہونا شروع ہوگیا تھا۔ تاہم وہ اس بنگلے میں 19 اپریل 1918ء یعنی اپنی شادی تک منتقل نہ ہوئے۔ چوں کہ قائد اور بیگم مریم جناح نے 1916ء میں ایک دوسرے سے شادی کے عہد و پیمان کیے تھے، اس لیے گمان یہی ہے کہ شادی شدہ زندگی گزارنے کی غرض سے ہی یہ مکان خریدا گیا۔ قائداعظم اس بنگلے کے چوتھے مالک تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جناح صاحب 1910ء سے لٹل گبز روڈ کے بنگلے میں ہی قیام پذیر رہے جو کہ ساؤتھ کورٹ سے کم وبیش ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ساؤتھ کورٹ کے صحن کو سیاسی ملاقاتوں کے لیے کبھی کبھار استعمال کرتے۔ ان چھے سات سالوں کے دوران اُنھوں نے یہاں دو مرتبہ عشائیوں کی میزبانی بھی کی۔ 1918ء میں اُن کی شادی کے موقع پر رسم نکاح اور ولیمہ اسی ساؤتھ کورٹ میں منعقد ہوا تھا۔ اُنھوں نے شادی پر یہ محل اپنی اہلیہ کو بطور تحفہ دے دیا۔ تاہم نکاح نامے پر مکان کی بجائے 1,25,000 روپے بطور ہدیہ دلہن کو دینے کا ذکر ہے، اور یہ وہی قیمت ہے جس پر مکان خریدا گیا تھا۔ یہ تحفہ ایک ہزار روپیہ حق مہر کے علاوہ تھا جو کہ نکاح نامہ میں الگ درج ہوا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ نکاح نامے پر جائیداد کے نام کی بجائے محض قیمت کیوں درج کی گی؟ ایک خاندانی وکیل کے مطابق مکان کی قانونی منتقلی کے لیے ضروری تھا کہ بیگم جناح میونسپل ریکارڈ کے مطابق ٹیکس دہندہ ہوں، جو کہ وہ نہیں تھیں۔ اس صورت میں نکاح نامے پر جائیداد کی بجائے اس کی قیمت درج کرنا پڑی۔ اس جوڑے کی شادی شدہ زندگی اسی مکان میں بسر ہوئی، یہاں تک کہ بیگم صاحبہ کے

انتقال کے سال بعد محمد علی جناح 1930ء میں انگلستان چلے گئے۔

بیگم مریم جناح کو پرانا پرتگالی طرز پر بنا ہوا یہ محل نما مکان پسند نہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اردگرد سفید سنگِ مرمر کے بنے ہوئے محلات، جن میں دو تو اُن کے رشتے داروں (والدین اور خالہ) کے تھے، کے سامنے ساؤتھ کورٹ ماند دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ بیگم صاحبہ نے ساؤتھ کورٹ کی تزئین وآرائش پر اپنی من مرضی سے رقم خرچ کی تھی لیکن اپنے شوہر پر اُنھوں نے یہ دباؤ برقرار رکھا کہ اس محل کی تعمیر نو ضروری ہے۔ تاہم کسی نہ کسی وجہ سے یہ منصوبہ التوا کا شکار ہوتا رہا۔ اس دوران مریم جناح کا 1929ء میں انتقال ہوگیا۔ اگلے برس محمد علی جناح انگلستان چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے ملا اینڈ ملا سولیسٹرز کے ذریعے مکان بیچنے کی کوشش کی لیکن کوئی سودا طے نہ ہوسکا۔ بہرحال اپنی زندگی میں اُنھوں نے دوبارہ کبھی اس محل میں قدم نہ رکھا۔

ساؤتھ کورٹ کی تعمیرِ نو یا ایک نیا تاج محل

محمد علی جناح نے 1934ء میں دوبارہ ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہ ساؤتھ کورٹ کی بجائے لٹل گبز روڈ والے پرانے مکان میں چلے گئے۔ 1918ء میں اُن کی شادی کے وقت سے یہ بنگلہ گزشتہ سولہ سال سے بند پڑا تھا۔ 1936ء میں قائد کے حکم پر ساؤتھ کورٹ کا 92 سالہ ڈھانچہ اپنی تمام یادوں کے ساتھ منہدم کردیا گیا۔ قائداعظم کے سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو کا خیال ہے کہ پرانے ساؤتھ کورٹ کے انہدام کی واحد وضاحت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ وابستہ تمام یادیں محمد علی جناح کے دل پر بہت بڑا بوجھ تھیں۔ آخر ساؤتھ کورٹ وہی گھر تھا جہاں اپنی محبوب اہلیہ مرحومہ کے ساتھ قائد کی زندگی کے حسین ترین سال بیتے تھے۔

1936ء میں جناح نے ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ کی جائیداد پر نئی عمارت کی تعمیر کے لیے کلاڈ باٹلے کی خدمات حاصل کیں۔ باٹلے اور کنگ بمبئی کے بہترین اور مہنگے ترین برطانوی ماہر تعمیرات تھے۔ محمد علی جناح کی آخری وصیت، جس پر باب 13 اور 14 میں تفصیلی بحث

ہے، 30 مئی 1939ء کو لکھی گئی۔ اس پر لٹل گبز روڈ بمبئی کا پتہ دیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کم از کم 1939ء تک لٹل گبز روڈ پر ہی رہ رہے تھے جبکہ نئے ساؤتھ کورٹ کی تعمیر جاری تھی۔

میسرز باٹلے اور کنگ نے نقشہ بنا کر بلدیہ بمبئی کے محکمہ تعمیرات سے منظوری کروالی۔ پھر مکان کی تعمیر کے لیے اشتہار دیا تو میسرز موتی چند کمپنی، میسرز پی ایس کار اور میسرز موسیٰ آدم جی وغیرہ نے اپنی اپنی پیشکش جمع کروائی لیکن قائداعظم کی نظر انتخاب ایک اطالوی کمپنی میسرز گین ڈنکرلی اینڈ کمپنی پہ پڑی کیوں کہ اس کمپنی نے پرانے مکان کو ڈھانے، ملبہ اٹھانے اور مکان میں لفٹ لگانے کے کام بھی اپنی پیشکش میں شامل کیے تھے اور لاگت صرف 2 لاکھ 136 روپے لگائی تھی۔

کام جلدی مکمل کرنے کے لیے اس کمپنی نے اہم کام ذیلی ٹھیکیداروں (Sub-Contractors) کو دے دیے مثلاً (1) میسرز رائل کمپنی نے اٹلی سے سنگ مرمر منگوا کر لگانے کا کام سنبھالا۔ (2) بھولا اینڈ کمپنی نے پانی فراہم کرنے اور پائپ کا کام سنبھالا۔ (3) کامدار اینڈ کمپنی نے اخروٹ کی لکڑی سے دروازے اور الماریاں بنانے کا کام کیا۔ (4) میسرز جی ای ایس نے تمام غسل خانے مکمل کیے اور (5) ملک الیکٹرونک کمپنی نے بجلی، بلب، پنکھے اور لفٹ کی تنصیب کا کام کیا۔

مکان کے تین حصے تھے: پہلا حصہ اہل خانہ کا تھا جس میں چار کشادہ خواب گاہیں (بیڈروم)، دیوان گاہ (ڈرائنگ روم)، طعام گاہ (ڈائننگ روم)، مطالعہ خانہ (سٹڈی)، سیکریٹری کا کمرہ، خواتین کا دیوان خانہ اور غلام گردشیں شامل تھیں۔

دوسرا حصہ مشرق میں تھا جو مہمان گاہ کہلاتا تھا۔ اس میں مہمانوں کی خواب گاہ، بیٹھک اور برآمدے وغیرہ تھے۔

تیسرا حصہ شمالی جانب ملازمین خانہ تھا جس میں دس رہائشی کوارٹر، باورچی خانہ (کچن)، مال خانہ (پینٹری) اور دھلائی خانہ (لانڈری) شامل تھے۔

ان تین حصوں کے علاوہ باغات بنوائے گئے۔ مرکزی عمارت سے 45 فٹ دور

سامنے ایک 14 فٹ قطر کا گول فوارہ ہے جس کے اردگرد 27 فٹ قطر کی پھلواری ہے اور اس کے اردگرد 18 فٹ چوڑی سڑک گول گھومتی ہے۔

محمد علی جناح کا ساؤتھ کورٹ کی پرانی عمارت کو گرا کر گھر کو مکمل طور پر نئے یورپی انداز میں نوکیلی محرابوں اور شاندار ستونوں کے ساتھ تعمیر کرانا بالکل ویسا ہی تھا جیسا بیگم مرحومہ چاہتی تھیں۔ محمد علی جناح نے ماہر تعمیرات پر واضح کر دیا کہ وہ ایک وسیع استقبالیہ کمرہ، بڑا برآمدہ اور وسیع صحن چاہتے ہیں جن میں تقریبات کا اہتمام ہو سکے۔ ان تقریبات کا اہتمام کرنے کے لیے بیگم مریم جناح حیات نہیں تھیں؛ چنانچہ نہ تو استقبالیہ کمرے میں مہمانوں کا استقبال ہوا اور نہ ہی تقریبات کے اہتمام کی نوبت آئی۔ ذہن پر جتنا مرضی زور دیں، محمد علی جناح کے ان احکامات کی اور کوئی وضاحت نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ یہ سب کچھ اپنی اہلیہ کی یاد میں کر رہے تھے کیوں کہ وہ گھر پر عظیم الشان استقبالیے دینے اور باغ میں تقریبات کا اہتمام کرنے کی دلدادہ تھیں۔ مصنفہ شیلا ریڈی اس نئے ساؤتھ کورٹ کو ''جناح کا اپنی اہلیہ کی یاد میں تعمیر کردہ تاج محل'' قرار دیتی ہیں۔

تعمیراتی کام اور تزئین و آرائش پر سوا دو لاکھ روپے لاگت آئی اور یہ ساڑھے تین سال کی مدت میں مکمل ہو کر ایک عالیشان بنگلہ بن گیا۔ اٹلی سے درآمد شدہ سنگِ مرمر اور اخروٹ کی لکڑی استعمال کی گئی۔ حتیٰ کہ پتھر لگانے والے مستری بھی اٹلی سے بلائے گئے۔ جب 23 اپریل 1940ء تک یہ مکمل ہو گیا تو محمد علی جناح نے لٹل گبز روڈ والا محل ایک ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر چڑھا دیا اور اس نئے تعمیر شدہ عالیشان محل میں فاطمہ جناح کے ہمراہ رہائش پذیر ہو گئے۔ اب یہ نیا محل ساؤتھ کورٹ کی بجائے نیا جناح ہاؤس کے طور پر جانا جانے لگا۔ قائداعظم کا ذاتی فون نمبر 4063 لٹل گبز والے بنگلے سے جناح ہاؤس منتقل کر دیا گیا۔

نئے جناح ہاؤس میں 22 ملازمین ہر وقت موجود رہتے تھے اور قائداعظم کے قیام کے آخری دور میں ان کی مجموعی تنخواہ 304 روپے ماہانہ تک پہنچ چکی تھی۔ مکان اور ملازمین کے تمام انتظامی اور مالی امور کی ذمہ داری محمد علی چائے والا کے سپرد تھی۔

لکڑی کا فرش اور کھلے برآمدے رکھنے والا یہ جدید طرز کا بنگلہ ستمبر 1944ء میں گاندھی

جی اور محمد علی جناح کے درمیان یہیں منعقد ہونے والی یادگار گفتگو کی وجہ سے تاریخی اہمیت اختیار کر گیا۔ اسی طرح آزادی سے ٹھیک ایک سال پہلے 15 اگست 1946ء کو محمد علی جناح اور جواہر لال نہرو کے درمیان مذاکرات کی اہم نشستیں بھی اسی بنگلے میں ہوئیں۔

ساؤتھ کورٹ فروخت کر کے نیا مکان بنوانے کا فیصلہ

تاہم ساؤتھ کورٹ کی تعمیر کے بمشکل تین سال بعد محمد علی جناح اسے فروخت کرنے کا سوچنے لگے۔ شاید اس کی وجہ اہلیہ مرحومہ سے جڑی ماضی کی وہی یادیں تھیں جن کا سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو نے ذکر کیا ہے۔ اب جبکہ عمارت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا تھا پھر بھی یہ جگہ اُنہیں پریشان کر دیتی ہوگی جہاں بیگم صاحبہ سے اُن کا ساتھ ناقابل فراموش تھا۔

1943ء میں بڑودا کی مہارانی نے یہ محل خریدنے کے لیے معائنہ کیا۔ مئی 1944ء میں ساؤتھ کورٹ، نظام آف حیدرآباد دکن کی کئی جائیدادوں میں سے ایک بنتے بنتے رہ گیا۔ ہوا یوں کہ اس ماہ نظام دکن کے مشیرِ تعمیرات زین یار جنگ اس جائیداد کے تخمینے کے لیے بمبئی آئے اور قبل از جنگِ عظیم دوئم کی آٹھ لاکھ تیس ہزار روپے قیمت لگائی۔ چنانچہ نظام دکن نے محمد علی جناح کو خط کے ذریعے محل خریدنے کی غرض سے آٹھ لاکھ پچاس ہزار روپے کی پیشکش بھجوائی۔ اُس وقت قائد، کشمیر کی دلفریب وادی کے تیسرے اور اپنی زندگی کے آخری دورے پر تھے۔ سری نگر سے 3 جون 1944ء کو آنے والی جوابی خط میں محمد علی جناح لکھتے ہیں، ''مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی ہے کہ آپ کی لگائی گئی قیمت انتہائی غلط ہے۔ موجودہ نرخوں کے مطابق تو صرف زمین کی قیمت ہی ساڑھے پندرہ لاکھ روپے ہے۔'' محمد علی جناح نے یہ کہتے ہوئے مزید بات چیت موقوف کر دی، ''مجھے افسوس ہے کہ موجودہ پیشکش پر آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ نیز مجھے یہ والی جائیداد فروخت کرنے کی بہت جلدی نہیں ہے۔'' 31 اکتوبر 1946ء کو سابقہ مالک سر آدم جی ابراہیم کے پوتے اے حسین نے دادا کا مکان واپس خریدنے کے لیے خط و کتابت کی۔

1947ء کے آغاز میں کچھ قیاس آرائیاں سامنے آئیں کہ محمد علی جناح ساؤتھ کورٹ

کو ڈالمیا خاندان کے ہاتھ بیس لاکھ روپے میں فروخت کرنے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ کی بیٹی دینا نے بھی اپنے والد کو خط لکھتے ہوئے اس کی فروخت کے بارے میں پوچھا اور استفسار کیا کہ کیا وہ اُسے والدہ کی کچھ یادگاریں دے سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے خط لکھتے ہوئے ان افواہوں کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ اُنہیں تاحال جائیداد کی معقول پیشکش نہیں ملی ہے۔ ڈالمیا کے نمائندے پدم پٹ سنگھانیہ نے بنگلے کا جائزہ تو لیا تھا لیکن قائداعظم کے خط سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے معقول قیمت کی پیشکش نہیں کی۔

مئی 1947ء میں قائد نے اسے ایک بار پھر فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن اُنہیں ساحلِ سمندر کے رخ پر تعمیر کردہ اس شاندار بنگلے کی معقول قیمت نہ مل سکی۔ اُن کے اپنے تعمیراتی مشیر نے مالابار پہاڑی پر بنی اس جائیداد کی قیمت پچیس لاکھ تجویز کی۔ چنانچہ قائد نے اے ایم تھاریانی ایسوسی ایٹ کی کسی اور فریق کی طرف سے لگائی گئی سترہ لاکھ کی پیشکش بھی مسترد کر دی۔ چند دن بعد پندرہ مئی کو محمد علی جناح نے ماہر تعمیر اور جائیداد کے امور کے مشیر یحییٰ مرچنٹ (جنہوں نے بعد میں کراچی میں قائد کے مقبرے کو ڈیزائن کیا) کو خط لکھ کر عراق کے بمبئی میں قونصل خانے کے ساتھ ہونے والے مذاکرات پر استفسار کیا۔ عراقی پیش کش اٹھارہ لاکھ تھی، جبکہ محمد علی جناح کم از کم پچیس لاکھ روپے کی توقع کر رہے تھے، لہٰذا عراقی پیشکش بھی قبول نہ کی گئی۔

جس دوران محمد علی جناح ساؤتھ کورٹ کو فروخت کرنے کی کوشش میں تھے، وہ ''سینڈ و قلعہ'' میں دلچسپی لے رہے تھے جس کی تشہیر کردہ قیمت پانچ لاکھ روپے تھی۔ یہ قلعہ بمبئی کے قریب اٹھارہ ایکڑ وسیع جائیداد کا نام تھا جس کے سامنے سمندر کا کھلا نظارہ تھا۔ مارچ 1947ء میں اس جائیداد کے مالکان سے بات چیت چل رہی تھی لیکن ابھی حتمی مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی جب وائسرائے نے تین جون کے منصوبے (تقسیم اور آزادی) کا اعلان کر دیا۔ آنے والے ہفتوں کے دوران جناح صاحب اتنے مصروف ہو گئے کہ اُنھوں نے ساؤتھ کورٹ فروخت کرنے اور سینڈ و قلعہ خریدنے کا منصوبہ ترک کر دیا۔ اس حوالے سے سب سے دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب نے یہ خرید و فروخت اُس وقت کی تھی جب

پاکستان کی حتمی آزادی کی تاریخ سامنے نہیں آئی تھی۔ جس لمحے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انتقالِ اقتدار کی تاریخ کا اعلان کیا تو اُنھوں نے جائیداد کی خرید وفروخت کی تمام بات چیت ختم کردی۔

محمد علی جناح بمبئی سے اپنا ناتہ کبھی نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ وہ اس شہر سے محبت کرتے تھے اور اسی شہر میں اُن کی محبت یعنی اہلیہ مرحومہ مدفون تھیں۔ اس سے پہلے ساؤتھ کورٹ کو فروخت کرنے کی تمام کوششیں بمبئی شہر سے رابطہ توڑنے کے لیے نہیں بلکہ یہ جگہ فروخت کرکے بمبئی ہی میں کسی اور مقام پر محل تعمیر کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی تھیں۔ درحقیقت اُنہیں ساؤتھ کورٹ والی رہائش گاہ سے پیار تھا کیوں کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ شادی کے بعد رہائش پذیر رہے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ گھر اُنہیں اُپنی اہلیہ کے ہمراہ گزارے ہوئے دنوں کی یاد دلاتا تھا جس کی وجہ سے وہ آزردہ ہوجاتے تھے۔ بیگم جناح کی رحلت کے فوراً بعد وہ انگلستان چلے گئے تھے، اور اُس وقت اُن کا ارادہ تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ حتیٰ کہ جب وہ واپس ہندوستان آئے تو بھی اُنھوں نے اس پرانے مکان میں قدم نہ رکھا جہاں اُنھوں نے اپنی اہلیہ کے ہمراہ دن گزارے تھے۔ وہ چھے سال بعد یہاں آئے جب اس محل کی تعمیر نو ہوچکی تھی۔ اس کے فوراً بعد حیرت انگیز طور پر اُنھوں نے اسے فروخت کرنے اور قریب ہی کوئی اور جائیداد خریدنے کا ارادہ کرلیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اہلیہ کی یادوں سے قربت رکھنے والے مکان میں اکیلے رہتے ہوئے جذباتی تناؤ محسوس کیا کرتے تھے۔

جب یہ بات قائد پر عیاں ہوگئی کہ اُنہیں نئی جائیداد سینڈوقلعہ کی تزئین وآرائش کا موقع نہیں ملے گا کیوں کہ اس کے لیے برس ہابرس درکار تھے تو اُنھوں نے اسے خریدنے اور ساؤتھ کورٹ فروخت کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اپنی باقی زندگی میں محمد علی جناح نے اس مکان کے ساتھ بے پناہ جذباتی وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ اُنھوں نے اس امید پر ساؤتھ کورٹ کو اپنی وصیت کے ذریعے ہمشیرہ فاطمہ جناح کے نام کردیا کہ اس طرح یہ جائیداد جناح خاندان میں ہی رہے گی۔ آخر میں ہوا یہ کہ نہ تو یہ بنگلہ فروخت ہوا اور نہ ہی فاطمہ جناح کے نام منتقل ہوسکا۔ اس وقت یہ جائیداد ملکیت کے تعین کے لیے پیچیدہ قانونی، سیاسی اور سفارتی لڑائیوں

کا مرکز ہے۔ بھارت میں ایسے انتہاپسندانہ سیاسی مطالبات بھی کیے جارہے ہیں کہ اسے منہدم کردیا جائے۔ اس موضوع پر آئندہ ابواب میں بات ہوگی۔

قائد کی جناح منزل بمبئی سے اُنسیت

محمد علی جناح، 7 اگست 1947ء کو اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ وہ پاکستان کے گورنر جنرل کا حلف اٹھانے جارہے تھے۔ ایئرپورٹ جاتے ہوئے وہ بیگم مریم جناح کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کے لیے رکے۔ جب تک وہ بمبئی میں تھے، وہ ہر جمعرات کو یہ رسم ادا کیا کرتے تھے۔ 7 اگست کو بھی جمعرات ہی تھی، اور یہ محض اتفاق نہ تھا۔

غیر جذباتی اور سنجیدہ مزاج انسان ہونے کی شہرت رکھنے والے محمد علی جناح بھی اس گھر سے اپنی جذباتی وابستگی نہ چھپا سکے۔ حتیٰ کے پاکستان کے گورنر جنرل کے طور پر بھی وہ اس جائیداد کے بارے میں فکرمند رہے۔ اُن کا کہنا تھا یہ محل کسی اطالوی شہزادے کے رہنے کے لائق ہے۔ اُنھوں نے پاکستان میں پہلے بھارتی سفیر یعنی ہائی کمشنر شری پراکاسا کو بلایا اور کہا کہ وہ وزیراعظم نہرو کو اُن کی طرف سے ذاتی طور پر درخواست کریں کہ اس بنگلے کو متروکہ جائیداد قرار نہ دیا جائے۔ اس کی بجائے یہ کسی یورپی مشن یا یورپی خاندان کو الاٹ کردیا جائے۔ وزیراعظم نہرو نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محمد علی جناح کی زندگی تک اس مکان کو متروکہ جائیداد قرار نہ دیا۔ بھارتی حکومت نے قائدِاعظم کو مالک کے طور پر تین ہزار روپے ماہانہ کرائے کی پیش کش کی۔ تاہم ستمبر 1948ء کو بانیٔ پاکستان کی اچانک رحلت کی وجہ سے یہ معاہدہ طے نہ پاسکا۔

جناح صاحب کی وفات کے بعد اُن کی وصیت کھولی گئی۔ سب کی بشمول فاطمہ جناح حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ یہ جائیداد اُن کے نام کردی گئی تھی۔ وصیت کی شق نمبر چھے کے مطابق فاطمہ جناح اس جائیداد کو جس طرح چاہیں استعمال کرسکتی تھیں۔ لہٰذا 22 ستمبر 1948ء کو فاطمہ جناح نے بذریعہ وکیل محمد علی چائے والا، امریکی سفیر چارلس لیوس سے ملاقات کی اور جناح منزل بمبئی 15 لاکھ روپے میں فروخت کی پیشکش کی۔ امریکی حکام نے خریدنے کی

بجائے 75 ہزار روپے سالانہ (یعنی 6250 روپے ماہانہ) کرایہ پر لینے میں دلچسپی ظاہر کی۔ مذاکرات مکمل ہونے سے پہلے ہی بھارتی حکومت آڑے آ گئی۔

قائد کی بہنوں میں سے فاطمہ جناح واحد بہن تھیں جو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی کراچی چلی آئی تھیں اور اُنھوں نے اس نوزائیدہ ریاست کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ بھارتی حکومت نے محمد علی جناح کو بطور گورنر جنرل کو جو تعاون دیا تھا وہ اُن کی ہمشیرہ کو حاصل نہ ہو سکا۔ 1949ء میں شدید سیاسی دباؤ کی وجہ سے بھارتی وزیرِ اعظم نہرو کو جناح ہاؤس کو متروکہ جائیداد قرار دینا پڑا۔ اس طرح جناح ہاؤس بھارتی حکومت کے قبضے میں چلا گیا۔ تاہم جناح صاحب کی خواہش کی پاسداری کرتے ہوئے اسے برطانوی حکومت کو پٹے پر دے دیا گیا۔ اس بنگلے میں برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر صاحبان عشروں تک رہائش پذیر رہے۔ یہ سلسلہ 1980ء کی دہائی میں موقوف ہوا۔ پہلی منزل کے کچھ کمرے برطانوی قونصل خانہ یعنی سفارتی مشن کے سینئر افسران کے دفاتر کے طور پر استعمال کیے جاتے رہے۔

آج کی جناح منزل

جنوبی ممبئی کی مالا بار پہاڑی پر اس جائیداد کا پرانا پتہ 3 ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ اب تبدیل ہو کر 2 بھاؤ صاحب ہیرے مارگ ہے۔ اس سے متصل احاطہ، مکان نمبر 1، بھاؤ صاحب ہیرے مارگ (سابقہ ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ) اب مہاراشٹرا کے وزیرِ اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ مالا بار کے کچھ دیگر اہم مکانات میں ہز ہائی نس پرنس کریم آغا خان (اسماعیلی حاضر امام)، مفضل سیف الدین (بوہرہ اسماعیلی برادری کے امام اور داعی) اور کچھ دیگر اہم شخصیات کے محلات ہیں۔

شدید تنازع کی وجہ سے آج کل جناح ہاؤس مقفل ہے۔ یہاں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ صرف پاکستان ہی اسے اپنے قونصل خانے کے طور پر حاصل نہیں کرنا چاہتا بلکہ خاندان کی دونوں شاخیں، واڈیا (قائد کی بیٹی دینا اور قائد کا نواسہ نصلی) اور پیر بھائیز (قائداعظم کی ہمشیرہ مریم پیر بھائی کا پڑنواسہ شاکر ابراہیم جو کہ ان کے داماد رجب علی ابراہیم

کے صاحبزادے ہیں) بھی اس کے قانونی طور پر دعوے دار بنے بیٹھے ہیں اور عدالتی جنگ میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ ان مقدمات کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ جیسا کہ لندن کے اخبار ''سنڈے آبزرور'' نے 2001ء میں لکھا: ''آج کل اس بنگلے میں صرف چمگادڑوں کا بسیرا ہے... اس کے باغ میں جہاں کبھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن، قائداعظم کے مہمان کے طور پر گہرے سبزے اور ناریل کے بلند درختوں کے درمیان ٹہلتے تھے، آج کل صرف خودرَو جھاڑیاں اور ویرانی ہے۔''

بھارتی حکومت جناح ہاؤس کو Enemy Property Act-1968 کے تحت دشمن کی جائیداد قرار دینے کے دباؤ کا 1968ء سے مقابلہ کرتی چلی آئی ہے۔ اس نے مکان کی حیثیت متروکہ جائیداد کے طور ہی برقرار رکھی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ تین پاک بھارت جنگوں کے باوجود بھی جناح منزل کو تاحال دشمن کی جائیداد قرار نہیں دیا گیا۔ دشمن کی جائیداد کی حیثیت قرار دینے سے یہ محل سرکاری نگران کی تحویل میں آ جائے گا۔ 2017ء کی ایک ترمیم سول عدالتوں اور دیگر حکام کو دشمن کی جائیداد کے بارے میں تنازعات کی سماعت سے روکتی ہے۔ اس لیے اگر اس مکان کو دشمن کی جائیداد یعنی اینیمی پراپرٹی قرار دے دیا جاتا ہے تو عدالتیں اس کی ملکیت پر چلنے والے تمام مقدمات کی سماعت کی مجاز نہیں رہیں گی۔

2018ء میں بھارت کی وزیر برائے خارجہ امور آنجہانی سشما سوراج نے اپنے ساتھی اراکین اسمبلی کو ایک تحریری جواب میں بتایا کہ ہند کے وزیرِ اعظم نے منظوری دے دی ہے کہ جناح ہاؤس کو اُن کی وزارت برائے خارجہ امور کے ماتحت انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز (آئی سی سی آر) کو دے دیا جائے۔ اس محل کی تزئین و آرائش کی جائے گی اور مناسب تبدیلیاں کرتے ہوئے اسے حیدرآباد ہاؤس دہلی کی طرز پر اعلیٰ سطحی وفود کی ملاقاتوں اور عشائیوں لیے مختص کر دیا جائے گا۔ پاکستان کی وزارتِ خارجہ نے اس اعلان پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اس جائیداد پر اپنے موقف کا اعادہ کیا اور بیان جاری کیا کہ جناح منزل کی حیثیت تبدیل کرنے کی کوئی بھی کوشش پاکستان کے لیے ناقابلِ قبول ہوگی اور کسی بھی ایسی حرکت سے دوطرفہ سفارتی تعلقات متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔

باب 3

جناح منزل، دہلی

10 اورنگ زیب روڈ، لیوٹنز گارڈنز
دہلی، بھارت
(موجودہ رہائش گاہ ولندیزی سفیر برائے جمہوریہ بھارت)

ولندیزی سفیر برائے جمہوریہ بھارت کی سرکاری رہائش گاہ کبھی 10 اورنگ زیب روڈ ہوا کرتی تھی۔ 2015ء سے سڑک کا نام تبدیل کیے جانے کی وجہ سے بنگلے کا پتہ 10 اے پی جے عبدالکلام مارگ ہو گیا ہے۔ یہ رہائش گاہ نئی دہلی کے سرسبز ترین اور انتہائی مخصوص علاقے لیوٹنز بنگلہ زون، یا محض لیوٹنز دہلی میں واقع ہے۔ یہ بنگلہ کبھی جناح منزل کہلاتا تھا۔ اس نام کی وجہ بلاشبہ اس مشہور انسان یعنی محمد علی جناح سے مناسبت تھی۔

یہ 1912ء کے دہلی دربار کا ذکر ہے جب انگریز سرکار نے دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ لیوٹنز تیس مربع کلومیٹر کا علاقہ ہے جسے انگریزوں نے 1930ء کی دہائی میں آباد کرتے ہوئے ہندوستان کے نئے دارالحکومت کا مرکز بنا دیا۔ اسے نئی دہلی کا نقشہ بنانے والے ماہر تعمیرات سر ایڈون لیوٹنز سے منسوب کیا گیا۔ لیوٹنز کے خدوخال میں شاہراہوں کا جال، ہر چوراہے پر گول چکر، منسلک سڑکیں جو مرکزی سڑک سے نکلتی یا اس میں شامل ہوتی ہیں اور درختوں کی لمبی قطاریں سایہ فگن ہیں۔ ان سایہ دار جگہوں میں مکانات وسیع و عریض بنگلوں کی صورت ہیں۔ ان کے اردگرد مزید

وسیع اور سرسبز میدان واقع ہیں۔

نئے دارالحکومت کے ابتدائی ایام میں ایک سرکاری ٹھیکیدار رائے بہادر سردار بیسا کھا سنگھ نے شہر میں حکومت کے لیے متعدد عمارتیں تعمیر کیں۔ 1929ء میں بیسا کھا سنگھ نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کرنے کے لیے تین ایکڑ کا پلاٹ لیا اور لیوٹنز کے مشہور ماہر تعمیرات بلومفیلڈ برادران کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے ایک عالیشان مکان کا نقشہ بنا کر تعمیر کا آغاز کر دیا۔ منصوبے کی تکمیل میں تین سال لگ گئے۔ ماہرین تعمیرات کو اپنی یہ تخلیق اتنی پسند آئی کہ اُنھوں نے اصلی مالک بیسا کھا سنگھ کو راضی کر کے اگلے چھے سال کے لیے اسی بنگلے کو اُس سے کرائے پر حاصل کر لیا اور اس میں رہنے لگے۔ جب بلومفیلڈ برادران واپس انگلستان چلے گئے، تب تک بیسا کھا سنگھ اس مکان میں خود رہنے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ لہٰذا اس نے 1938ء میں اس کو برائے فروخت لگا دیا۔ محمد علی جناح نے اس بنگلے کا ایک لاکھ میں سودا کر لیا۔ پانچ ہزار روپے ایڈوانس ادا کیا اور ساتھ ہی اطالوی کمپنی میسرز گینن ڈنگرلی اینڈ کمپنی کو مکان کی آرائش و مرمت کا کام دے دی، وہی کمپنی جو بمبئی میں آپ کے لیے نیا مکان تعمیر کر رہی تھی۔

جب رنگ و روغن مکمل ہوا تو دو کمپنیوں وارنگ اینڈ گلیوز اور برک اینڈ کمپنی کو مکان کے لیے فرنیچر، قالین اور دیگر ساز و سامان کا آرڈر دیا اور دونوں کو چار چار ہزار روپے ادائیگی کی گئی۔ دریں اثنا بقایا 95 ہزار روپے ادائیگی کے ساتھ ہی مکان کی رجسٹری 5 دسمبر 1938ء کو قائداعظم کے نام کر دی گئی۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے دوران (29-1918) محمد علی جناح، دہلی کے اپنے ہر دورے میں ہمیشہ میڈن ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کی اہلیہ مریم جناح بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن 1930ء کی دہائی میں اُن کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ اُنھوں نے سوچا کہ دہلی میں بھی ایک ذاتی مکان ہونا چاہیے۔ اس وقت تک دہلی میں واقع مرکزی قانون ساز اسمبلی میں اکثریت حاصل کر کے ہمارے قائد سب سے بڑے پارلیمانی بلاک کے سربراہ بن چکے تھے۔

یہ ذکر برمحل ہوگا کہ 1923ء کی مرکزی قانون ساز اسمبلی میں سوراج پارٹی (کانگرس کا باغی گروپ) کی 38 نشستیں تھیں جبکہ محمد علی جناح کی قیادت میں آزاد گروپ کے پاس 19 نشستیں تھیں۔ انگریز حکومت 41 نامزد ممبران کو اپنے پکے اتحادی قرار دے سکتی تھی۔ 1926ء کے انتخابات میں جناح کی قیادت میں آزاد پارٹی کی نشستیں بڑھ کر 22 ہوگئیں جبکہ سوراج پارٹی اور نامزد ممبران کی تعداد جوں کی توں رہی۔ 1930ء کے انتخابات کا سوراج پارٹی کانگرس نے بائیکاٹ کردیا جبکہ محمد علی جناح انگلستان جا بسے۔ 1934ء کے انتخابات کے نتائج میں اسمبلی کی عددی پوزیشن تبدیل ہوگئی۔ محمد علی جناح کی جماعت 44 ممبران کے ساتھ سب سے بڑی پارلیمانی گروپ بن گئی۔ انڈین نیشنل کانگرس کی وہی بیالیس نشستیں تھیں جبکہ نامزد کردہ ممبران کی تعداد بھی 41 تھی۔ لہٰذا دہلی کے سیاسی مدوجزر میں سب سے بڑے سیاسی رہنما کے طور پر قائدِاعظم کی موجودگی ضروری ہوچکی تھی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، 1929ء میں اہلیہ کی وفات کے بعد محمد علی جناح کسی ایسی عمارت میں قیام پسند نہ کرتے تھے جہاں وہ مرحومہ کے ساتھ شادی شدہ زندگی کے دن گزار چکے تھے۔ لہٰذا میڈن ہوٹل دہلی میں دوبارہ قیام خارج از امکان تھا۔ مزید یہ کہ اب آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر مقام بھی لکھنو سے دہلی منتقل ہوگیا تھا۔ مسلم لیگی ساتھیوں کے اصرار پر محمد علی جناح دارالحکومت میں مکان حاصل کرنے پر راضی ہوگئے۔ دہلی شہر میں قائد کی نگاہِ انتخاب لیوٹنز کا بہترین علاقہ تھا جہاں کسی نے اُنھیں بیسا کھا سنگھ والے مکان کے برائے فروخت ہونے کا بتایا۔ آپ اس سے پہلے علی پور روڈ اور فلیگ سٹاف روڈ پر کئی ایک بنگلے ناپسند کر چکے تھے۔ اورنگ زیب روڈ پر یہ تین ایکڑ وسیع بنگلہ قائد کے دل کو بھا گیا اور قیمت بھی نہایت مناسب لگی۔

جناح صاحب 1939ء میں اس قیمت پر یہ مکان حاصل کر کے اتنے خوش ہوئے اُنھوں نے اپنی طبیعت کے برعکس نئے گھر میں ایک پُرمسرت ضیافت بھی دے ڈالی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تقریب اتنی شاہانہ تھی کہ کئی سال بعد بھی اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔ یہ کئی ایک تقریبات کا نقطۂ آغاز تھا جن کا اہتمام یہاں آنے والے سالوں میں کیا جاتا رہا۔

اگرچہ ان تقریبات میں سے اکثر کا مقصد پاکستان کے لیے حمایت حاصل کرنا تھا۔ محمد علی جناح اس مکان میں اگلے آٹھ سال کے دوران 1947ء تک گاہے گاہے رہائش اختیار کرتے رہے اور اُن کے ہمراہ فاطمہ جناح ہوتیں۔ جناح ہاؤس بمبئی کی طرح جناح ہاؤس دہلی بھی بہت سی یادگار ملاقاتوں اور اہم واقعات کا گواہ بنا۔

قائداعظم نے دہلی والے مکان کے لیے بھی 19 افراد کا عملہ رکھ لیا جن میں دو بٹلر، دو خدمت گار، ایک آیا، دو باورچی، چار حمال یعنی قُلی، دو ڈرائیور، دو چوکیدار اور چار مالی شامل تھے۔ ان کی مجموعی تنخواہ 1946ء تک 187 روپے ماہوار ہوچکی تھی۔ دہلی والے مکان کے دیگر ملازمین کی نگرانی اور تمام تنخواہوں اور بلوں کی ادائیگی سید شمس الحسن کی ذمہ داری تھی۔ دہلی اور بمبئی دو گھروں کا انتظام چلانے کے لیے قائداعظم کا ماہانہ خرچہ 500 روپے سے بڑھ کر 1000 روپے تک پہنچ گیا۔ اس مکان میں قائداعظم کا فون نمبر 2432 تھا۔

صحافی ویوک شکلا کے الفاظ میں ان میں سے ایک تاریخی واقعہ جو نئے مکان کی زینت بنا، وہ محمد علی جناح، گاندھی جی اور راجندر اپرساد کے درمیان 1939ء میں تقسیم کے تصور پر ہونے والی بات چیت تھی۔ راجندر اپرساد بعد میں جمہوریہ بھارت کے پہلے صدر بنے تھے۔ اُس گفتگو کے بعد وہ تینوں محمد علی جناح کی سبز پیکارڈ گاڑی میں وائسرائے کے محل جو ایک میل کے فاصلے پر تھا میں ایک اور مختصر اجلاس کے لیے گئے تھے۔ جب آزادی کی تحریک اپنے حتمی ہدف کے قریب بڑھی تو جناح ہاؤس دہلی میں باقاعدگی سے اہم اجلاس ہونے لگے۔ درحقیقت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تقسیم پر حتمی فیصلہ اسی مکان کی لائبریری میں کیا گیا تھا۔ یہ اس مکان کی تاریخ کا سب سے اہم لمحہ تھا۔

شاید اس بنگلے کے بہترین وضع قطع رکھنے والے باغات میں پیش آنے والا سب سے اہم موقع 13 جولائی 1947ء کو ہونے والی پریس کانفرنس تھی۔ اس وقت کے برصغیر کے ہر اہم اخبار کا نمائندہ اُس موقع پر موجود تھا۔ یہ وہ موقع تھا جب محمد علی جناح نے ماؤنٹ بیٹن کے 3 جون والے منصوبے کو قبول کرنے کا باضابطہ اعلان کیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت برطانوی ہند کو دو ریاستوں، پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنے اور آزادی

دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ 1947ء میں جناح صاحب جانتے تھے کہ اُن کا دہلی میں وقت ختم ہونے کو ہے، چنانچہ اُنھوں نے وہ مکان اپنے قریبی دوست اور بہت بڑی ہندو کاروباری شخصیت راما کرشنا ڈالمیا کے ہاتھ تین لاکھ روپے میں فروخت کر دیا۔ یکم اگست 1947ء کو دس ہزار روپے بیعانہ ادا ہوا۔

محمد علی جناح کے قریبی اور قابلِ اعتماد ساتھی لیاقت علی خان کی رہائش بھی زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ اپنی اہلیہ رعنا لیاقت علی کے ساتھ 8-ہارڈنگ لین (موجودہ 8- تلک مارگ) میں رہتے تھے۔ یہ ان کے کردار کی اعلیٰ مثال ہے کہ 1947ء کے ہنگاموں میں لیاقت علی خان کو اپنا گھر فروخت کرنے کا موقع نہ ملا کیوں کہ دہلی کے مسلم کش فسادات میں بیسیوں مسلمان خاندانوں کو انہوں نے اس گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ کھانا پینا، راشن کا انتظام بیگم رعنا کرواتیں۔ اُنہیں پاکستان کے لیے فوری طور پر روانہ ہونا پڑا جہاں وہ نوزائیدہ ریاست کے پہلے وزیرِاعظم بن گئے۔ جب وہ 1951ء میں شہید ہوئے تو پورے پاکستان میں لیاقت علی خان کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا۔ بھارتی حکومت نے پہلے تو لیاقت علی خان کے مکان کو متروکہ جائیداد قرار دینے کی کوشش کی لیکن بعد میں سفارتی دباؤ پر اسے پاکستان کو واپس کر دیا۔ حکومتِ پاکستان نے لیاقت ہاؤس کو بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ کا درجہ دے دیا۔ بیگم رعنا لیاقت علی خان کے نام پر اس بنگلے کا نام گلِ رعنا تھا جسے تبدیل کر کے ''پاکستان ہاؤس'' کر دیا گیا ہے۔ آج بھی پاکستان کا ہر ہائی کمشنر دہلی میں اسی مکان میں رہائش اختیار کرتا ہے۔

لیکن جناح ہاؤس کے ساتھ معاملہ مختلف تھا کیوں کہ اُسے ایک بھارتی شہری نے خرید لیا تھا۔ اُس جائیداد کو متروکہ کا درجہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ جناح منزل کے نئے مالک راما کرشنا ڈالمیا بھارت کے چوٹی کے صنعت کار اور ملک کے اہم ترین اخبار ''دی ٹائمز آف انڈیا'' کے مالک تھے۔ یہ وہی ڈالمیا تھے جن کے بارے میں اوائل 1947ء میں افواہ پھیلی تھی کہ وہ بمبئی کا جناح ہاؤس بھی خرید چکے ہیں۔ ڈالمیا نے مکان کا قبضہ اُس وقت لیا جب محمد علی جناح کا سامان وغیرہ اکتوبر 1947ء کے اختتام تک پاکستان کے

دارالحکومت کراچی منتقل کر دیا گیا۔

ڈالمیا کی اہلیہ دنیش نندنی ڈالمیا ایک مشہور ہندی افسانہ نویس اور شاعرہ تھی۔ جب ڈالمیا اور جناح صاحب کے درمیان مکان خریدنے کے لیے بات چیت چل رہی تھی تو وہ بھی چند ایک مواقع پر اس مکان میں آئی تھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جناح صاحب کے ڈرائنگ روم میں اُن کی اہلیہ مریم جناح کی تصاویر آویزاں تھیں گرچہ اُنہیں دنیا سے رخصت ہوئے اٹھارہ برس بیت چکے تھے۔ اس طرح پاکستان کی تخلیق کے لیے جو بھی مذاکرات کیے گئے گویا بیگم جناح اپنی تصاویر کے پردے سے سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ دیگر سامان کی طرح یہ تصاویر بھی کراچی کے جناح ہاؤس یعنی پرانے فلیگ سٹاف ہاؤس میں منتقل کر دی گئیں جہاں سے پھر یہ کبھی نہ مل سکیں۔

بقایا رقم مبلغ 2 لاکھ 90 ہزار روپے بذریعہ چیک نمبر D2/A363151 مورخہ 30 دسمبر 1947ء کو قائداعظم کے نیشنل بینک آف انڈیا، کراچی برانچ کے کھاتہ نمبر 1 میں جمع کروائی گئی۔ چنانچہ 10 جنوری 1948ء کو مکان کی رجسٹری ڈالمیا کے نام کر دی گئی۔

اگرچہ محمد علی جناح ہمیشہ اپنے دوست کو سیکولر سمجھتے تھے لیکن ڈالمیا نے سب سے پہلے تو اس مکان کو دریائے گنگا کے پانی سے دھویا۔ ہندو گنگا کے پانی کو مقدس سمجھتے ہیں۔ ڈالمیا نے ایسا اس لیے کیا کیوں کہ اس مکان کے پچھلے مکین یعنی قائدِاعظم اور فاطمہ جناح مسلمان تھے۔ پھر اس کے بعد اُس نے مسلم لیگ کا سبز اور سفید پرچم بھی اتار کر گائے تحفظ تحریک کا پرچم لہرا دیا اور اس مکان کو گاؤ ماتا تحریک کا مرکز بنانے کا اعلان کیا۔

تقسیم کے بعد چند ہی مہینوں میں مسلمانوں کی کئی ایک جائیدادیں بھارتی حکومت نے متروکہ قرار دے کر اپنی تحویل میں لے لیں۔ اپنی حالیہ خریداری کی بابت خطرہ محسوس کرتے ہوئے ڈالمیا نے نہایت ہوشیاری سے داؤ کھیلا۔ جناح صاحب کی روانگی کے تین ماہ بعد اس مکان کو ولندیزی سفیر کو 5,025 روپے ماہانہ پر کرائے پر دے دیا۔ ایک تو بھارت کا نیا دارالحکومت بننے کی وجہ سے دہلی پر آبادی کا دباؤ بڑھ رہا تھا تو دوسری طرف پاکستان کی طرف سے آنے والے ہندو اور سکھ مہاجرین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اس

لیے آنے والے چند برسوں کے دوران جائیداد کی قیمت آسمان کو چھونے لگی۔ 1951ء میں ڈالمیا نے اپنی کرایہ دار ولندیزی حکومت کے ہاتھ وہ مکان پانچ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا۔ گویا جس قیمت پر خریدا تھا اس سے ڈیڑھ گنا زیادہ قیمت پر۔ ڈالمیا کے وہ مکان فروخت کرنے کے پیچھے جو بھی مقاصد ہوں کم از کم جناح صاحب زندہ ہوتے تو اس فیصلے کو ضرور پسند کرتے۔ اُنھوں نے بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو کے نام خط میں اپنے بمبئی والے مکان کے بارے میں لکھا: ''جناب وزیراعظم، اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی حکومت اس مکان کا اُس طرح خیال نہیں رکھ سکتی جیسے میں رکھتا تو برائے مہربانی اسے کسی امریکی یا یورپی سفارت کار کو کرائے پر دے دیں۔'' قائد کا دہلی والا بنگلہ بھی یورپی سفارت کاروں کے ہاتھ آیا اور آج بھی ہے۔

جو کبھی شاہانہ جناح ہاؤس دہلی ہوا کرتا تھا وہ اب بھارت میں ولندیزی سفیر کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ بھارت میں آنے والے ہر ولندیزی سفیر نے اس مکان میں قیام کیا ہے۔ 2018ء میں اس مکان کی قیمت آٹھ ارب بھارتی روپے (بارہ کروڑ امریکی ڈالر) لگائی گئی تھی۔ ان بیتے عشروں میں ولندیزی سفارت خانے نے کئی بار حکومتِ پاکستان یا لیاقت ہاؤس (بھارت میں پاکستانی ہائی کمشنر) کی درخواست قبول کرتے ہوئے پاکستان سے آنے والے سفارت کاروں یا سرکاری افسروں کو سابق جناح منزل کے دورے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔

آج یہ مکان جناح ہاؤس کے طور پر اپنا وجود نہیں رکھتا لیکن بمبئی کے جناح ہاؤس کی طرح اس پر سے بھی جناح صاحب کی چھاپ مٹائی نہیں جا سکی۔ اس مکان کے قریب ہی دہلی کے علاقے پہاڑ گنج اور کیرول باغ کے مسلمانوں نے جناح فٹ بال کلب قائم کیا ہوا ہے۔ یہ علاقے لیوٹنز کے قریب ہی ہیں۔ کچھ ہندو کھلاڑی بھی اس کلب میں کھیلتے ہیں۔ اُنھوں نے جناح کے نام سے ایک فٹ بال ٹورنامنٹ شروع کیا جو بہادر شاہ ظفر گراؤنڈ میں کھیلا جاتا ہے جہاں قریب ہی شہید بھگت سنگھ بس ٹرمینل بھی ہے۔ پس جناح کا نام دہلی سے مٹایا نہ جا سکا۔

باب 4

جناح منزل، کراچی

241۔ سٹاف لائنز، بونس روڈ، کراچی، پاکستان

(موجودہ جناح ہاؤس میوزیم)

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں موجود قائداعظم ہاؤس میوزیم برطانوی دور میں فلیگ سٹاف ہاؤس کہلایا کرتا تھا۔ جنوبی ایشیا اور انگلستان میں قائداعظم کے دیگر گھروں کی طرح یہ بھی وسیع احاطے کے گرد چاردیواری رکھنے والا 10,241 مربع گز (کم و بیش بیس کنال یا 2.4 ایکڑ) پر پھیلا ہوا کشادہ بنگلہ تھا۔ زرد چونے کے پتھر سے تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت کے گرد پرانے درختوں سے بھرا ہوا سرسبز باغ ہے۔ یہ تاریخی عمارت محرابی دروازوں، منقش ستونوں، نیم بیضوی بالکونیوں اور چھے کشادہ کمروں پر مشتمل ہے۔ ان چھے کمروں میں سے دو سونے کے کمرے ہیں، دو مہمان گاہ یعنی ڈرائنگ روم، ایک مطالعہ کا کمرہ اور ایک کھانے کا کمرہ ہے۔

قراردادِ پاکستان 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منظور ہوئی۔ اس کے بعد قائداعظم مسلسل مستقبل کے پاکستان میں مکان، پلاٹ وغیرہ خریدتے رہے۔ 1941ء ہی سے آپ نے کراچی میں باتھ آئی لینڈ، کلفٹن روڈ اور گزری سمیت کئی جگہ مکان اور پلاٹ کی خریداری میں دلچسپی ظاہر کی اور قیمتوں پر استفسار کرتے رہے۔ جنگ عظیم دوم کی وجہ سے پورا کراچی چھاؤنی کا منظر پیش کرتا تھا اور تمام عمدہ بنگلے فوج کے تصرف میں تھے۔ آخر

میں قائداعظم کو جو بنگلہ پسند آیا، وہ بھی فوج کے پاس بطور کرایہ دار موجود تھا۔

محمد علی جناح نے اس مکان کو 1943ء میں 115,000 روپے میں خریدا تھا۔ ریکارڈ کے مطابق پانچ ہزار روپے ایڈوانس ادا کیے گئے۔ بلدیہ اندراج کے مطابق جائیداد کا نمبر 241 سٹاف لائنز، کراچی کینٹ تھا۔ یہ پرشکوہ عمارت کراچی کی بونس روڈ (موجودہ فاطمہ جناح روڈ) پر واقع ہے جو کہ الفن سٹون سٹریٹ (موجودہ زیب النسا سٹریٹ) کی توسیع ہے۔ اس کے علاوہ 65 ہزار روپے کا قانونی تمسکہ (Indemnity Bond) بھی جمع کروایا گیا جو اس 1,15,000 روپے کے علاوہ تھا۔ یوں دیکھا جائے تو مکان کی مجموعی قیمت 1,80,000 روپے بنتی ہے۔

چھت کی ایک ٹائل پر 1868ء کا سن درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عمارت اُس سال تعمیر کی گئی تھی۔ اپنی تعمیر کے ڈیڑھ صدی بعد بھی یہ علاقہ دو کروڑ سے زائد آبادی رکھنے والے شہر، کراچی کا قریباً مرکز بنتا ہے۔ دہلی اور ممبئی میں واقع جناح ہاؤسز کے گرد و نواح کی طرح اس بنگلے کے آس پاس بھی بے حد اہمیت کی حامل عمارات ہیں جیسا کہ صوبہ سندھ کا گورنر ہاؤس، وزیر اعلیٰ ہاؤس، پارسی کلب، کراچی جمخانہ، وکٹوریہ مینشن، فریئر ہال اور شہر کے چار فائیو سٹار ہوٹلوں میں سے تین۔ یہ سب کے سب جناح ہاؤس سے ایک میل کے رداس میں واقع ہیں۔ اگر جناح صاحب ایک بار پھر دنیا میں آتے تو اُنہیں شاید دوبارہ کراچی میں اس سے بہتر محلِ وقوع نہ ملتا جہاں جناح ہاؤس آج بھی آب و تاب کے ساتھ کھڑا ہے۔

اس پُرشکوہ بنگلے کو کراچی میں مقیم ایک مقامی یہودی ماہر تعمیرات، موسز سمو کے نے ڈیزائن کیا تھا۔ کراچی میں موجودہ بہت سی تاریخی عمارتوں پر اس ماہر تعمیر کا نقش موجود ہے کیوں کہ سمو کے نے شہر کی دیگر مشہور عمارتوں کو بھی ڈیزائن کیا جیسا کہ میولز مینشن، کراچی گوان ہال، ایڈورڈ ہاؤس اور بائی ویر بھائی جی سوپاریوالہ پارسی ہائی سکول۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بی وی ایس ہائی سکول کہلانے والی یہ درسگاہ جب 1859ء میں قائم ہوئی تو یہ صرف پارسی زرتشت برادری کے طلبہ کی ضروریات پوری کرتی تھی۔ ایک طویل عرصے تک یہ سکول

مسلمان یا دیگر مذاہب کے طلبہ کو داخلہ نہیں دیتا تھا۔ 1947ء میں آزادی کے بعد گورنر جنرل جناح کی درخواست پر سکول نے اپنے دروازے دیگر قومیتوں پر بلا امتیاز کھول دیے۔

چلئے کراچی کی جناح منزل کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس عمارت میں 1868ء سے 1922ء تک رہنے والے افراد کے نام نامعلوم ہیں۔ 1922ء کے بعد کا ریکارڈ موجود ہے جس کے مطابق رام چند ہنس راج کچھی لوہانہ اس کے مالک تھے۔ اس کے انتقال کے بعد، بیٹے نے یہ عمارت کراچی کے میئر سہراب کاؤس جی کٹرک اور اُن کی اہلیہ دینا کے ہاتھ فروخت کر دی۔ محمد علی جناح نے اس جوڑے سے یہ مکان دسمبر 1943ء میں خریدا تھا۔ محمد علی جناح کی ساس اور بیٹی، دونوں کا نام دینا ہی تھا۔ معلوم نہیں کہ کیا اس مماثلت نے اس جائیداد کو خریدنے کی ترغیب دی۔ ان دونوں میاں بیوی کو 1,15,000 روپے ادا کیے گئے جبکہ 65 ہزار روپے کا قانونی تمسکہ مکان کی تیسری حصہ دار ویرا کے نام کیا گیا جو ان دونوں کی بیٹی تھی۔ یہ رقم ویرا کٹرک کو 21 سال کی عمر کو پہنچنے پر ملنا تھی۔

جناح ہاؤس بمبئی کا کراچی والے اس مکان سے قیمت کا موازنہ بھی دلچسپ ہے۔ اُس وقت (1940ء کی دہائی میں) یکساں رقبہ رکھنے والے مکانات کی قیمت کا تقابلی جائزہ بتاتا ہے کہ بمبئی کی نسبت ویسا ہی رقبہ اور حجم رکھنے والے کراچی کے مکانات بیس گنا سستے تھے۔ 1943ء میں قائداعظم حصولِ پاکستان کی جدوجہد کر رہے تھے لیکن ابھی یہ بات ابھی طے نہ تھی کہ نئی مملکت کا دارالحکومت کراچی ہی ہوگا۔ چنانچہ اس شہر میں اتنا بڑا مکان خریدنا قائداعظم کی اپنی جائے پیدائش سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

قبل ازیں یہ جائیداد فلیگ سٹاف ہاؤس کے نام سے جانی جاتی تھی کیوں کہ برطانوی ہند فوج نے اسے 1930ء کی دہائی میں کرائے پر لیا تھا اور یہ کراچی کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کی رہائش گاہ ہوا کرتی تھی۔ بنگلے کے باغ میں ایک بڑا جھنڈا (فلیگ) ایک اونچے ڈنڈے (سٹاف) پر لہراتا رہتا تھا، جس کی وجہ سے اس مکان کا نام ہی فلیگ سٹاف ہاؤس پڑ گیا۔ اس وقت جائیداد رام چند لوہانہ جو کہ غالباً پچھلے مالک ہنس راج لوہانہ کا بیٹا تھا سے بیگم وسہراب کاؤس جی کٹرک کے نام منتقل کی گئی۔ اس مقام سے توپ خانہ اور اسلحہ

ACC. # 21488
MADAR-I-MILLAT LIBRARY
AIWAN-I-QUAID-I-AZAM
NAZARIA-I-PAKISTAN TRUST

ڈپو زیادہ دور نہیں تھے چنانچہ یہ کمانڈر ہاؤس کے لیے ایک موزوں ترین جگہ تھی۔ لہٰذا برطانوی فوجی حکام نے اسے کرائے پر حاصل کرنے کے لیے اس کے نئے مالکان مسٹر اور مسز کٹرک سے بات چیت کر کے نئے کرایہ نامہ پر دستخط کیے۔ اس کے بعد فوجی کمانڈر بریگیڈیر ہارٹوئیل، میجر جنرل سی ڈرنفورٹ، میجر جنرل این جی ہنڈ اور میجر جنرل ڈگلس ڈیوڈ گریسی نے یکے بعد دیگرے اس مکان میں رہائش اختیار کی۔ فوج اس کے مالکان کو ماہانہ 435 روپے کرایہ ادا کرتی رہی۔ جب تمام قانونی معاملات کے بعد، محمد علی جناح کے نام مکان کی رجسٹری 8 مارچ 1944ء کو کر دی گئی تو بھی اسے بدستور فلیگ سٹاف ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس کی حیثیت تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اب وہی کرایہ جناح صاحب کو ادا کیا جانے لگا۔ اُن کے آخری کرائے دار میجر جنرل ڈگلس گریسی تھے جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے۔ یہ وہی لیفٹیننٹ جنرل گریسی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد پاک فوج کے دوسرے کمانڈر انچیف بنے۔

1947ء میں محمد علی جناح نے اورنگزیب روڈ دہلی والا مکان فروخت کر دیا، جیسا کہ گزشتہ باب میں ذکر ہوا۔ اُنہوں نے اپنا تمام سامان بشمول اپنی اہلیہ مرحومہ کے سامان جس میں ان کی نادر تصاویر بھی شامل تھیں، کراچی لانے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ اُنھوں نے بمبئی کا ساؤتھ کورٹ فروخت نہیں کیا تھا لیکن اس میں موجود سامان بھی اُنہیں واپس پاکستان لانا تھا کیوں کہ اس سے اُن کی جذباتی وابستگی تھی۔ اس مقصد کے لیے جناح صاحب نے اپنا کراچی والا بنگلہ فوج سے خالی کرالیا۔ کرنل حق نواز کی نگرانی میں دہلی سے قائداعظم کا سامان 21 کریٹوں میں بذریعہ ٹرک کراچی لایا گیا اور فلیگ سٹاف ہاؤس میں پہنچا دیا گیا۔ آج یہی سامان بطور عجائب گھر اس مکان میں سجایا گیا ہے۔

جب محمد علی جناح 7 اگست 1947ء کو بطور پہلے گورنر جنرل کراچی پہنچے تو اُنہیں گورنر جنرل ہاؤس میں رہائش اختیار کرنی پڑی (آج کل یہ گورنر ہاؤس سندھ کہلاتا ہے: دیکھیے ضمیمہ ج)۔ قائد کا 11 ستمبر 1948ء کو اسی سرکاری رہائش گاہ میں انتقال ہو گیا۔ لہٰذا اُنہیں جناح منزل کراچی میں ایک دن بھی گزارنے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ جیسا کہ اوپر ذکر

ہو چکا ہے، اس مکان میں اُن کا جناح منزل دہلی اور جناح منزل بمبئی سے لایا گیا وہ سامان رکھا گیا تھا جس کو ہندوستان سے خصوصی انتظامات کے ذریعے پاکستان پہنچایا گیا تھا۔

جب خواجہ ناظم الدین نے 1948ء میں قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کے نئے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا تو مس فاطمہ جناح کو گورنر جنرل ہاؤس سے جناح منزل کراچی میں منتقل ہونا پڑا۔ یہاں وہ 1964ء تک رہائش پذیر رہیں۔ ان سولہ برسوں کے دوران حکومتِ پاکستان پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ شاید فاطمہ جناح کبھی بھی بمبئی کے جناح ہاؤس کی ملکیت حاصل نہیں کر سکیں گی چنانچہ وہ پاکستان میں اس کے مساوی متروکہ املاک کی حقدار قرار پائیں۔ اُنہیں کراچی کا موہاٹا محل (Mohatta Palace) الاٹ کر دیا گیا جس میں وہ اگلے تین سال یعنی 1967ء میں اپنی وفات تک مقیم رہیں۔ (دیکھیے ضمیمہ د)۔

فاطمہ جناح کے قیام کے 16 برسوں میں قائداعظم ٹرسٹ کے تمام اجلاس اسی مکان میں منعقد ہوئے۔ قائداعظم کے سیکریٹری کے ایچ خورشید (جو بعد میں آزاد کشمیر کے صدر بنے) بہت عرصہ محترمہ فاطمہ جناح کے سیکریٹری رہے۔ وہ اور ان کی اہلیہ ثریا خورشید، فاطمہ جناح کے ساتھ اسی بنگلے کی انیکسی میں رہتے رہے۔ وہ محترمہ فاطمہ جناح کی تمام ملاقاتوں اور سیاسی اجلاسوں کا انتظام کرتے اور محترمہ کو کی گئی خط و کتابت کا جواب دیتے۔ فاطمہ جناح کی صدارتی انتخاب کی مہم میں فلیگ سٹاف ہاؤس ان کا انتخابی دفتر بنا رہا اور ایک بہت بڑی لالٹین (محترمہ فاطمہ جناح کا انتخابی نشان) باہر آویزاں رہتی تھی۔

حکومتِ پاکستان نے 14 فروری 1985ء کو دو عشروں سے خالی جناح منزل کراچی، قائداعظم ٹرسٹ سے بذریعہ ہاشم رضا اور لیاقت مرچنٹ (ٹرسٹی) 51,07,000 روپے میں خرید لی اور یہ رقم ٹرسٹ فنڈ میں جمع کروا دی گئی۔ قائداعظم کے زیرِ استعمال بستر، کرسیاں، کپڑے، گھڑیاں اور دیگر اشیا ابھی بھی یہیں پڑی ہوئی تھیں۔ چنانچہ جناح ہاؤس کو ایک عجائب گھر میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا گیا جہاں قائداعظم کی اشیا کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ عجائب گھر عوام کے لیے سوموار کے سوا، ہفتے کے تمام دن صبح نو سے شام پانچ بجے تک کھلا رہتا ہے۔

اس بنگلے کی حیثیت بھی وہی تھی جو کراچی کے جناح ہاؤس کی۔ یعنی کہ یہ بھی فوجی حکام کے زیر استعمال تھا۔

فوجی حکام نے دوسری عالمی جنگ شروع ہونے سے چند ماہ پہلے دفاع ہند قواعد یعنی ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت یہ مکان حاصل کیا تھا۔ اس کا قبضہ کنٹونمنٹ لینڈ ایکوزیشن (سی ایل اے) رولز کے شیڈول VII کے تحت لیا گیا۔ اسے پندرہ فروری 1939ء کو کرائے پر لینے کے باوجود معاہدے کو یکم فروری سے نافذ العمل سمجھا گیا۔ ماہانہ کرایہ علامتی طور پر پانچ روپے طے کیا گیا جو فوج ادا کرتی رہی۔ جب قائداعظم نے جولائی 1943ء میں یہ مکان خریدا تو فوج کی کرایہ داری کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ تاہم جنوری 1944ء میں فوج نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ 575 کے تحت بنگلہ دوبارہ اپنے تصرف میں لے لیا۔

اوائل 1944ء سے وسط 1945ء تک قائداعظم اور ان کے وکلا اور فوجی حکام میں خاصی خط و کتابت ہوتی رہی۔ قائداعظم کو نہ صرف زبردستی ان کے مکان کے تصرف پہ اعتراض تھا بلکہ ان کی مرضی کے بغیر تعمیراتی تبدیلیوں، نئے باورچی خانوں کی تعمیر اور بجلی کی تمام تنصیبات کی تبدیلی پر بھی تحفظات تھے۔ پنجاب کے سیکریٹری داخلہ مسٹر ولیمز کی مداخلت اور یکے بعد دیگرے تین آئی سی ایس افسران، پہلے مسٹر جی ڈی کھوسلہ، پھر مسٹر ایس این ہسکر اور پھر شیخ عبدالرحمٰن نامی بیوروکریٹس کو فوج اور قائداعظم کے مابین ثالث مقرر کیا گیا۔ آخرالذکر بعد ازاں پاکستان کے چیف جسٹس بھی بنے جو جسٹس ایس اے رحمٰن کے نام سے مشہور تھے۔ ثالثی کی کارروائی کی دستاویزات تو اَب دستیاب نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ انہوں نے مکان کو واگزار تو نہ کروایا لیکن 1945ء سے 700 روپے ماہانہ کرایہ مقرر کر کے فریقین میں دو سالہ معاہدہ کروایا جس کی رُو سے پٹہ کی میعاد 28 اپریل 1947ء کو ختم ہونا تھی۔

میعاد ختم ہونے سے چند ہی ہفتے پہلے 3 جنوری 1947ء کو قائداعظم کو گیریژن انجینئر لاہور کی طرف سے مراسلہ موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا:

''لاہور کے ایریا کمانڈر کی طرف سے مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کو افسوس کے ساتھ مطلع کروں کہ لاہور میں فوجی ضروریات کے لیے عمارتوں کی شدید کمی کے باعث، آپ کا مکان جو بطور فوجی میس کے کام آ رہا ہے، آپ کو کرایہ کی میعاد ختم ہونے کے بعد بھی تاحکمِ ثانی واپس نہیں کیا جا سکے گا۔ اس عسکری لاچاری کے باعث آپ کی جو دل آزاری ہوئی، اس کے لیے ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔''

دریں اثنا جنوری 1947ء میں حکومت پنجاب نے پورے صوبے کی بجلی کو ڈی سی کرنٹ سے اے سی کرنٹ میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور ہر عمارت کے معائنہ کا حکم دیا تاکہ تصدیق کی جا سکے کہ آیا برقی تنصیبات اے سی کرنٹ کی متحمل ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ بصورتِ دیگر عمارتوں میں کسی بڑے حادثے مثلاً آگ لگنے کے خدشات تھے۔ قائداعظم نے مکان کے معائنہ کی اجازت تو دے دی لیکن کرایہ دار کو یک طرفہ طور پر تنصیبات تبدیل کرنے سے منع کر دیا۔

اس سے پہلے کہ قائداعظم مکان واپسی سے اس انکار کے خلاف عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرتے، 2 مارچ 1947ء کو پنجاب کی یونینسٹ سرکار مستعفی ہو گئی اور لاہور شہر، ہولناک ہندو مسلم فسادات کی زد میں آ گیا۔ شہر میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی اور جگہ جگہ کرفیو لگائے جانے لگے۔ جون کا مہینہ آ پہنچا اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 14/15 اگست 1947ء برصغیر کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دی اور 3 جون کو اس کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ جب پتہ چلا کہ مالک مکان تو پاکستان کے نئے گورنر جنرل کے طور پر نامزد ہو چکے ہیں تو انگریز فوجی افسران نے پینترا بدلا اور یکم اگست 1947ء کو کرنل اے آر ہارس نے قائداعظم کو خط لکھ کر 31 اگست تک بنگلہ خالی کر کے واپس حوالے کرنے کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ قائداعظم کی اپنی مصروفیات بطور سربراہِ مملکت، لاہور میں مسلسل فسادات اور بدنظمی، جس کی وجہ سے برقی تنصیبات بحال کرنے والے ہنرمند کاریگروں کی عدم دستیابی اور دیگر مسائل کے باعث مکان سے فوجی میس کا انخلا اور قائداعظم کے نمائندوں کے حوالہ کرنا جنوری 1948ء تک ملتوی ہونا ناگزیر ٹھہرا تو کرایہ نامہ میں توسیع کر دی گئی۔

31 جنوری 1948ء کو بنگلے کی توسیع شدہ لیز ختم ہوگئی اور اسے محمد علی جناح کے نمائندہ سید مراتب علی کے حوالے کرنے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ اگرچہ لیز ختم ہونے کے کاغذات جمع کرائے گئے اور اس کے لیے درکار دفتری کارروائی ہوئی لیکن ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کے نئے فوجی حکام نے کسی متبادل جگہ کے بندوبست تک مکان کو استعمال کی اجازت طلب کی۔ اپنے نمائندے کے ذریعے محمد علی جناح یہ رعایت دینے کے لیے رضامند ہوگئے ہوں گے کیوں کہ بات اب پاک فوج کی تھی، برطانوی فوج کی نہیں۔ لیکن اس کے چند ماہ بعد وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تو بنگلہ ابھی بھی فوج کے زیرِ استعمال تھا۔ قائداعظم کے نمائندے سید مراتب علی مشہور کاروباری اور انسان دوست شخصیت سید بابر علی کے والد تھے۔ سید بابر علی، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) کے بانی ہیں۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد فوج نے بنگلے کی لیز برقرار رکھنے کے لیے محمد علی جناح کے ورثا فاطمہ جناح اور شیریں جناح سے بات چیت کی۔ وزارتِ دفاع نے بحوالہ خط نمبر 3-Q/561/28، بتاریخ 18 فروری 1950ء پانچ سو روپے ماہانہ کرائے کی پیش کش کی۔ یہ سابقہ کرایہ سے دو سو روپے کم رقم تھی۔ معاہدے کے بعد مکان کو پاک فوج کے دسویں ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کی سرکاری رہائش گاہ قرار دے دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1950ء کی دہائی میں جناح صاحب کی ہمشیرگان سے مکان خرید کر اسے کور کمانڈر لاہور کی رہائش گاہ میں تبدیل کرنے کے لیے رابطہ قائم کیا گیا۔ وزیرِ دفاع ایوب خان نے اس کی منظوری بھی دی۔ 21 مارچ 1959ء کو بیع نامہ پر دستخط ہوئے تو ایوب خان ملک کے صدر بن چکے تھے۔ طے شدہ قیمت مبلغ 3 لاکھ 50 ہزار روپے جناح ٹرسٹ کے فنڈ میں جمع کروائی گئی اور 18 اپریل 1959ء کو مکان کی رجسٹری افواجِ پاکستان کے نام ہوگئی۔ تاہم اس کا نام ابھی تک جناح ہاؤس لاہور ہی ہے۔

اس کتاب میں بیان کیے گئے چاروں جناح ہاؤسز میں سے یہ واحد مکان ہے جس میں نہ تو جناح صاحب اور نہ ہی بیگم جناح ایک دن کے لیے بھی قیام کر پائے۔ قائداعظم اور اُن کی اہلیہ نے 1926ء میں کشمیر جاتے ہوئے لاہور کے تاریخی فلیٹیز ہوٹل کے

سویٹ نمبر 18 (موجودہ سویٹ 101) میں قیام کیا تھا۔ اس کے بعد قائد ایک مرتبہ پھر جولائی 1929ء میں غازی علم دین کا مقدمہ لڑنے لاہور آئے۔ بیگم مریم جناح پانچ ماہ قبل انتقال کر چکی تھیں۔ جناح صاحب فلیٹیز ہوٹل کے اُسی سویٹ میں ٹھہرے۔ یہ سویٹ اب قائدِ اعظم سویٹ کے طور پر اس ہوٹل میں محفوظ کیا گیا ہے۔ 1948ء میں قائدِ اعظم محمد علی جناح بطور گورنر جنرل پاکستان لاہور تشریف لائے اور سٹیٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ اس دوران اُن کا یہ بنگلہ ابھی تک فوج کے زیرِ استعمال تھا۔ فوجی حکام نے مصنف کو تصدیق کی اُس دوران قائدِ اعظم مختصر وقت کے لیے جناح ہاؤس میں تشریف لائے اور سٹڈی روم میں پاکستانی فوجی کمانڈروں کے ساتھ چائے نوش کی اور تھوڑی دیر کے لیے صحن میں چہل قدمی کی۔ لاہور کے ہر کور کمانڈر کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے کہ اُن کو ایک ایسے بنگلے میں رہائش گاہ دی جاتی ہے جو کہ کبھی بانیٔ پاکستان کی ذاتی ملکیت تھا۔

جناح ہاؤس لاہور، بانیٔ پاکستان سے نسبت کی وجہ سے پوری قوم کی میراث ہے۔ دعا ہے کہ یہ بنگلہ، پاکستان کے ہر شہری کے لیے کھول دیا جائے۔

باب 6

پیپلز جناح ہال، بمبئی

کانگرس ہاؤس لین، 396، وٹل بھائی پٹیل روڈ،
نزد گرانٹ روڈ، ممبئی، 004 400، بھارت
(موجودہ پی جے ہال)

قائدِاعظم محمد علی جناح کی یادوں سے جڑی ہوئی ایک اور عمارت پیپلز جناح ہال ہے جو گرانٹ روڈ بمبئی کے قریب واقع ہے اور جہاں قریب ہی کبھی کانگرس ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ کانگرس کا صدر مقام دہلی منتقل کیے جانے سے پہلے سالہا سال تک بمبئی میں رہا جس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر مقام کئی عشروں تک لکھنور ہا تھا لیکن پھر دہلی کے دارالحکومت بن جانے پر اسے اس نئے دارالحکومت میں منتقل کیا جانا پڑا۔ ممبئی میں کانگرس ہاؤس کی عمارت تو باقی نہیں ہے لیکن اس مقام کے سیاسی ماضی کی یاد دلانے کے لیے پیپلز جناح ہال البتہ آج بھی کھڑا ہے۔ جنوبی ممبئی کی لیمگٹن روڈ سے نکلنے والی گرانٹ روڈ ہمہ وقت ٹریفک سے لبریز ایک پرہجوم کمرشل سڑک بن چکی ہے جہاں الیکٹرانکس کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔ اس پرہجوم محل وقوع میں یہ ہال شکستہ حالت میں قائم تو ہے لیکن کوئی خاص نمایاں نہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ کوئی بورڈ یا اشارہ بھی آویزاں نہیں۔ لگتا ہے کہ یہ ہال اپنی کسمپرسی پر آنسو بہا رہا ہو۔

یہ ہال جناح صاحب کی ذاتی ملکیت نہیں تھا۔ جیسا کہ اس کے نام میں ''پیپلز'' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عوام کی ملکیت تھا۔ اسے بمبئی کے شہریوں نے قائد اور بیگم جناح کی عزت افزائی کے لیے تعمیر کیا تھا۔ بمبئی کے شہریوں نے 1918ء میں نوآبادیاتی نظام کے غیر مقبول گورنر لارڈ ولینگڈن کی یادگار بنانے کی کوشش کو پرامن احتجاج سے ناکام بنا دیا تھا۔ اس واقعے کا پس منظر یوں ہے کہ حکومت کے کچھ خوشامدیوں نے اعلان کیا کہ وہ رخصت ہوتے ہوئے گورنر کے نام پر ایک یادگار تعمیر کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کریں گے۔ بیگم و محمد علی جناح نے اعلان کیا وہ اس یادگار کو تعمیر کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ اُنھوں نے اس یادگار کی تعمیر کے خلاف ہزارہا افراد کے متعدد احتجاجی مظاہروں کی قیادت کی۔ ٹاؤن ہال میں مذکورہ قرارداد پیش کی گئی تو اندر پولیس کی کارروائی کے دوران ایک طرف جناح صاحب زخمی ہو گئے تو دوسری طرف ہال کے باہر بیگم صاحبہ نے پولیس کا سامنا کیا۔ پولیس نے پانی کی توپ استعمال کی تو بیگم جناح پانی سے شرابور ہو گئیں۔ لارڈ ولینگڈن کے لیے یادگار تعمیر کرنے کی قرارداد کبھی منظور نہ ہو سکی۔ مریم جناح اور محمد علی جناح کی بہادری کے اعتراف میں یادگار تعمیر کرنے کے لیے لوگوں نے ''ایک روپیہ فنڈ'' کے تحت 65,000 روپے اکٹھے کر لیے۔

چوں کہ ان مظاہروں کی قیادت بیگم و محمد علی جناح کر رہے تھے، اس لیے ان میں ایک بھی جان ضائع نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف تاریخ گواہ ہے کہ برطانوی راج کے دوران گاندھی جی کے نام نہاد پُرامن احتجاجی مظاہروں میں انسانی خون بارہا پانی کی طرح بہتا دکھائی دیا کرتا تھا۔ قائدِاعظم اور ان کی اہلیہ نے یہ ہال تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ یہ اُن کی غیر موجودگی میں تعمیر ہوا۔ اُس وقت وہ دونوں مشہور صحافی ہارنیمن کی واپسی کا مقدمہ لڑنے کے لیے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ شروع میں ہزاروں افراد نے ایک روپیہ فی کس چندہ دیا تو عوامی فنڈز سے تعمیر ممکن ہوئی۔ تاہم قائدِاعظم نے برطانیہ سے واپس آتے ہی تعمیری لاگت کے 65 ہزار روپے اپنی جیب سے ادا کر دیے جبکہ عوام کے جمع کردہ 65 ہزار کو ضرورت مند بچوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔

تاہم اس پی جے ہال کی قائدِاعظم اور اُن کی اہلیہ کے ساتھ وابستگی نے آزادی کے بعد پاک بھارت تناؤ کی وجہ سے معاملات پیچیدہ کر دیے۔ بھارتی حکومت اس ہال سے بے اعتنائی برتنے لگی جو آج تک جاری ہے۔ معروف بھارتی صحافی اے جی نورانی نے بہت برمحل بات کی کہ مالا بار پہاڑی، ممبئی کی ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر واقع جناح منزل (سابق ساؤتھ کورٹ) پاکستان کے حوالے کرنے سے بھارتی انکار تو کسی حد تک قابلِ فہم ہے لیکن اسی شہر میں لیمگٹن روڈ کے قریب کانگرس ہاؤس کے احاطے میں جناح ہال سے غفلت برتنا ناقابلِ معافی مذموم حرکت ہے جس کا کوئی اخلاقی یا سیاسی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا۔ جناح ہاؤس تو چلیں محمد علی جناح کی ذاتی جائیداد تھی، چنانچہ مرکزی حکومت نے آزادی کے بعد متروکہ جائیداد قرار دے کر اسے اپنے قبضے میں لے لیا لیکن ہال جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے عوام کی ملکیت ہے۔ یہ عوامی چندے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعے اُس شخص یعنی محمد علی جناح کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا جو کبھی بمبئی کا بے تاج بادشاہ کہلاتا تھا۔

اے جی نورانی لکھتے ہیں کہ محمد علی جناح کو اپنی زندگی میں بہت جلد کامیابی کی بلندی مل گئی تھی۔ شاید ہی کسی اور عوامی شخصیت کی یادگار اُس کی زندگی میں تعمیر کی گئی ہو۔ لیکن ایک شخص جس نے ابھی اپنی زندگی کی بیالیس بہاریں بھی نہیں دیکھی ہوں کی عزت افزائی کے لیے عوام کی محبت کے ذریعے یادگار کی تعمیر کی نظیر جنوبی ایشیا کی کم از کم حالیہ تاریخ میں تو نہیں ملتی۔ اُس وقت محمد علی جناح کے پاس کوئی سرکاری عہدہ تو تھا نہیں، اس لیے وہ خوشامدیوں پر اثر انداز ہو کر اُنہیں اپنے لیے یادگار کی تعمیر کے لیے تحریک چلانے کی ترغیب تو دے نہیں سکتے تھے۔ یہ قائد اور اُن کی نوجوان اہلیہ تھیں جو اپنے وقت کی طاقت ور سلطنتِ برطانیہ کے سامنے سینہ سپر ہوئے تھے اور عوام نے اس احسان کے اعتراف میں ازخود قومی یادگار یعنی پی جے ہال بنا ڈالا۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اس ہال میں کبھی کوئی اجلاس نہیں بلایا تھا۔ اس کی بجائے اس ہال میں پردیش (یعنی صوبائی) کانگرس کمیٹی، بمبئی کے اجلاس ہوتے تھے۔ یہ

بعد میں آزاد بھارت کے پہلے صدر راجندرا پرشاد تھے جنہوں نے برطانوی راج کے دوران چوبیس جون 1939ء کو پابندی کے فیصلے کے خلاف کیے گئے کانگرس کے اجلاس کی صدارت کی تھی۔

پی جے ہال کی اہمیت آزادی کے بعد بھی برقرار رہی۔ مسٹر نورانی نشاندہی کرتے ہیں کہ 1975ء میں پورے بھارت میں اندرا گاندھی کی نافذ کردہ ہنگامی حالت کے دوران وکلا کی بمبئی کمیٹی برائے سول لبرٹی نے شہری آزادیوں اور قانون کی حکمرانی کی پامالی کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے شہر کے وکلا کا جلسہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس جلسے کے لیے اُنھوں نے پیپلز جناح ہال کا انتخاب کیا۔ یہ وکلا کا ایک نجی اجلاس تھا کیوں کہ عوامی جلسوں پر پابندی تھی۔ اس میں دیگر مقررین کے علاوہ محمد علی جناح کے سابق معاون اور بعد میں مہاراشٹرا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بننے والے محمد علی کریم چھاگلہ اور بھارت کے سابق چیف جسٹس جے سی شاہ نے بھی خطاب کیا۔ پولیس کمشنر نے جلسے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ 16 دسمبر 1975ء کو مہاراشٹرا ہائی کورٹ نے ایک آئینی درخواست کی سماعت کرتے ہوئے اہم فیصلہ سنایا اور پولیس کمشنر کے احکامات کو معطل کر کے جلسے کی اجازت دے دی۔

پاک بھارت سیاست کے درمیان پیدا ہونے والی قطبیت نے اب اس تاریخی ہال کو محفوظ بنانا مشکل کر دیا ہے صرف اس لیے کہ کبھی شہریوں نے اس کے ذریعے محمد علی جناح کی عزت افزائی کی تھی۔ آج اس ہال کا انتظام جناح ٹرسٹ کے پاس ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ جب بیگم و محمد علی جناح انگلستان کے دورے سے واپس آئے تو اُنھوں نے عوامی چندے سے تعمیر شدہ ہال دیکھا اور فوراً بمبئی کے عوام کو چندے کے 65,000 روپے واپس لوٹا دیے۔ اسی رقم سے جناح ہال ٹرسٹ کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ ٹرسٹ اپنا نام، جس میں جناح آتا ہے، اس ہال کے ایک کونے میں بنے اپنے دفتر پر بھی استعمال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ہال کی تعمیر کے تقریباً ایک صدر بعد، راقم الحروف فروری 2013ء کو جناح ہال

کی تلاش کے لیے بمبئی گیا۔ اس ہال کے مقام کی کسی نقشے پر نشاندہی موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کی سمت کا کوئی حوالہ ملتا ہے کہ یہ دراصل ہے کہاں۔ بھارت میں پاکستانی ہائی کمیشن تک کو اس کے محل وقوع کا مطلق علم نہ تھا۔ ہال کے بارے میں بمشکل اتنا ہی پتہ چل پایا کہ یہ سابق کانگرس ہاؤس کے احاطے میں ہوتا تھا۔ کانگرس ہاوس بھی اب موجود نہیں لیکن اس کے اردگرد کا علاقہ آج بھی کانگرس ہاؤس ہی کہلاتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری سڑک، ایک گلی کے بعد دوسری گلی کھنگالتے ہم جناح ہال تلاش کرتے رہے۔ علاقے میں جس سے بھی پوچھا کسی نے اس کا نام بھی کبھی نہیں سنا تھا۔ ہم تھک چکے تھے۔ آخر کار ایک زردی مائل خستہ حال پلازہ دکھائی دیا جس کا چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس کے اندر ملبوسات وغیرہ کے سٹال تھے۔ اُس روز پارسی خواتین ایسوسی ایشن کی طرف سے فلاحی سیل لگی تھی کہ ہم بھی وہاں چلے گئے۔ اس کے ایک سٹال پر ''پی جے ہال'' کے الفاظ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے ہماری تمام کھوج اس ایک لمحے میں سمٹ آئی ہے۔ میں نے سٹال چلانے والی عورت سے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے کہ پی جے کا کیا مطلب ہے؟ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ہم بکنگ آفس گئے جہاں دو نوجوان افراد تھے جنہوں نے اپنا تعارف پردیپ اور رام چندرا کے طور پر کرایا۔ ہم نے اس کے کرائے کی تفصیل وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ سکیورٹی کے خطرے کی وجہ سے وہ کاغذات، رسید یا خط وغیرہ پر لفظ جناح کبھی استعمال نہیں کرتے ہیں، چھپے ہوئے الفاظ صرف ''پیپلز ہال'' یا پی جے ہال ہیں۔ حالات کے پیش نظر اسے اب جناح ہال یا پیپلز جناح ہال نہیں لکھا جا سکتا۔

ہال کی عمارت کی بالائی سیڑھیاں رہائشی فلیٹس کی طرح کی چھوٹی اور تنگ زینوں پر مشتمل ہیں۔ فلیٹس کی تعداد تیس کے قریب ہے۔ ان میں جناح کے آبائی علاقے بھارتی صوبے گجرات سے تعلق رکھنے والے کچھ غریب خاندان آباد ہیں۔ جناح صاحب کے تصور کے مطابق یہ فلیٹس مستحق مسلمان، ہندو اور مسیحی خاندانوں کو کسی مذہبی امتیاز کے بغیر الاٹ کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خاندان تو 1960ء کی دہائی سے یہاں رہ رہے ہیں اور وہ ابھی بھی پانچ روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ کرایہ، جو

صرف چند فلیٹوں کا ہے، پانچ سو روپے ماہانہ بھی اکیسویں صدی کے لحاظ سے بہت معمولی ہے۔ ہال کو کمرشل مقاصد سے قرب و جوار کے غریب خاندانوں کو تقریبات کے لیے کرائے پر دیا جاتا ہے۔ اس کا کرایہ 2,500 روپے فی تقریب ہے جو کہ برائے نام رقم ہے۔ ہال کی سالانہ آمدن ایک لاکھ بھارتی روپے ہو جاتی ہے اور یہ تمام رقم غریب خاندانوں کے بچوں کو ترجیحی بنیادوں پر دیے جانے والے وظائف پر خرچ ہوتی ہے۔

محمد علی جناح اور اُن کی اہلیہ بیگم مریم جناح آج دنیا میں موجود نہیں لیکن اُن کی یاد میں تعمیر کردہ ہال بین المذاہب ہم آہنگی کے اُن کے خواب کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس میں شہری علاقوں کے غریب افراد سستی رہائش رکھتے ہیں اور ضرورت مند طلبہ کو وظائف دیے جاتے ہیں۔ افسوس کہ یہ ہال بھی پاک بھارت رقابت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ممبئی کے شہریوں کا حق ہے کہ حکومت اُن کے تعمیر کردہ ہال کو قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھے۔

باب 7

قائداعظم کی زرعی، کمرشل اور متفرق جائیداد

قائداعظم نے اپنی زندگی میں لاہور اور کراچی میں زرعی اراضی خریدی۔ کچھ کمرشل پلازے بھی خریدے، ساحل سمندر پر تفریح کے لیے ایک ہٹ بنوایا اور کچھ پلاٹ لیے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

اچھرہ لاہور میں زرعی اراضی اور گلبرگ کے پلاٹ

لاہور میں قائداعظم کی مجموعی زرعی اراضی 324 کنال، 2 مرلہ اور 39 مربع گز قیام پاکستان سے پہلے 1945ء میں نواب افتخار ممدوٹ سے 2,91,780 روپے میں موضع اچھرہ میں خریدی گئی تھی۔ واضح رہے کہ اُس زمانے کا موضع اچھرہ، لاہور کے موجودہ مین بولیوارڈ اور لبرٹی مارکیٹ تک کا علاقہ کہلاتا تھا جو کہ آج کل کے اچھرہ بازار سے 3 کلومیٹر کے رداس میں واقع ہیں۔ ان کے خسرہ نمبر 2028 تا 2075، 82-2181 اور 3540 تا 3557 تھے جن کا انتقال بنام محمد علی جناح کسی محمد اکرم نامی رینٹ کلکٹر درجہ دوم نے کیا تھا۔ قائد کی وفات کے بعد 18 اپریل 1949ء کو شیر علی پٹواری کے دستخط سے نیا فرد جارہ ہوا جس کے تحت رقبے کا انتقال جناح ٹرسٹ کو کر دیا گیا۔

قائداعظم کے انتقال کے بعد گلبرگ 2 سکیم کا آغاز ہوا تو لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ (جو آج کل لاہور ڈویلپمنٹ اتھارٹی یعنی ایل ڈی اے بن چکی ہے) نے 281 کنال

14 مرلے اس سکیم میں شامل کر لیے اور مبلغ 3,13,154 روپے بطور معاوضہ محترمہ فاطمہ جناح کو ادا کر دیا جو انہوں نے قائداعظم ٹرسٹ میں بچوں کی تعلیم کے لیے جمع کروا دیے۔ کئی سال بعد جب گلبرگ 3 سکیم کا اجراء ہوا تو قائداعظم کی باقی ماندہ 43 کنال بھی اس کی زد میں آ گئی۔

معاوضہ کے طور پر رقم کی جگہ چار پلاٹ محترمہ فاطمہ جناح کو الاٹ ہوئے جن میں پلاٹ نمبر 88, EL/79 اور 87 آٹھ آٹھ کنال کے تھے جبکہ پلاٹ نمبر 85 تین کنال، یوں کُل 27 کنال رقبہ ملا۔ ان پلاٹوں پر 2000 روپے فی کنال ایل ڈی اے کو بطور ڈویلپمنٹ چارجز (ترقیاتی اخراجات) ادا کیے جانے تھے۔ فاطمہ جناح اپنی زندگی میں بارہا کوشش کے باوجود پلاٹ فروخت نہ کر سکیں۔ ان کی وفات کے تقریباً 11 سال بعد قائداعظم ٹرسٹ نے جنوری 1978ء میں 8,8 کنال والے تینوں پلاٹ امریکی قونصل خانہ کو 37 لاکھ 30 ہزار 650 روپے میں فروخت کیے جبکہ تین کنال والا پلاٹ (EL/85) خواجہ نسیم نامی شہری نے اگست 1974ء میں 5 لاکھ 73 ہزار 300 روپے میں خرید لیا۔ یہ تمام رقم قائداعظم ٹرسٹ میں جمع ہو کر بعد میں تعلیمی مقاصد میں کام آئی۔ 1997ء میں امریکی قونصل خانہ نے یہ تمام پلاٹ کریسنٹ انوسٹمنٹ بینک کو بیچ دیے۔

اس کے علاوہ قائداعظم کا ڈیڑھ کنال کا کمرشل پلاٹ لبرٹی مارکیٹ میں موجود سونیری بینک کے ساتھ مسجد کے سامنے کارنر پلاٹ تھا جو فروخت ہو چکا ہے۔ انڈسٹریل ایریا لاہور کے صنعتی علاقے میں دس کنال کا صنعتی پلاٹ میں نمبر 32 بھی تھا، جس کی 1985ء میں نیلامی ہوئی اور میسرز کشمیر لمیٹڈ نے خرید کر مطلوبہ قیمت قائداعظم فنڈ میں جمع کروا دی۔

ملیر کراچی میں زرعی زمین

قیامِ پاکستان سے پہلے قائداعظم جب بھی کراچی تشریف لاتے تو ہمیشہ سر عبداللہ ہارون کے گھر پر قیام فرماتے۔ 1942ء میں سر عبداللہ ہارون کے انتقال کے بعد آپ بسا اوقات ملیر میں واقع نواب آف بہاولپور کے دونوں محلات جو الشمس اور القمر کہلاتے تھے، میں سے کسی ایک میں قیام فرماتے تھے۔ دونوں محلات کے درمیان کی زمین اور سامنے

112 ایکڑ کا ایک باغ نواب کی ملکیت تھا۔قومی آرکائیوز میں موجود فاطمہ جناح کے نام عنایت اللہ اینڈ سنز کے ایک خط سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظم نے نواب بہاولپور سے یہ 112 ایکڑ کا باغ قیمتاً خریدا تھا اور نواب صاحب کی یہ درخواست کہ وہ یہ باغ تحفتاً رکھ لیں، کو قبول نہیں فرمایا تھا۔لہٰذا قمر الزماں عباسی کی کتاب ''قائداعظم اور ریاست بہاولپور'' میں یہ دعویٰ کہ ملیر میں 112 ایکڑ کا باغ نواب بہاولپور صادق عباسی نے قائد کی ہمشیرہ فاطمہ جناح کو تحفے میں دیا تھا، قیاس آرائی کہ علاوہ کچھ نہیں۔قائداعظم ایسے بھارے تحائف وصول کرنے کو بدعنوانی خیال کرتے تھے،لہٰذا کبھی کسی سیاسی شخصیت سے ایسا تحفہ نہیں لیا۔

فروری 1947ء میں آپ نے ڈپٹی کمشنر کراچی سے اپنے ملیر والے باغ سے متصل خالی سرکاری اراضی میں سے 18 ایکڑ لیز پر لینے کی خواہش ظاہر کی تاکہ ایک ایکڑ پر فارم ہاؤس بنوائیں اور باقی 17 ایکڑ پر جدید طرز کی کاشت کاری کا فارم بنائیں۔کلکٹر کراچی نے خسرہ نمبر، 247,246,243,241 آپ کے نام پر اس شرط پر الاٹ کی کہ آپ اس کی مروّجہ قیمت سرکاری خزانہ میں جمع کروائیں جو آپ نے کروادی۔اس طرح نئے 18 ایکڑ ملا کر ملیر میں آپ کا کُل رقبہ 120 ایکڑ ہوگیا۔آپ کا ایک زرعی فارم بنوانے کا خواب، خواب ہی رہ گیا کیوں کہ پانچ ماہ بعد پاکستان آزاد ہوا اور آپ بطور گورنر جنرل ایسے مصروف ہوئے کہ کبھی اس زمین پر توجہ نہ دے سکے۔

آپ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد فاطمہ جناح نے اخبارات میں ملیر اراضی برائے فروخت کا اشتہار دے ڈالا لیکن کوئی مناسب گاہک ہی نہ ملا۔فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد قائداعظم ٹرسٹ نے 8,01,398 روپے میں اراضی فروخت کر کے تمام رقم تعلیم کے نام وقف فنڈ میں جمع کروادی۔

کیماڑی میں تفریح کے لیے ساحلی ہٹ

کراچی کے مغرب میں قائداعظم نے ساحل پر بلی جی گاؤں کے قریب گابو پٹ نامی علاقے میں وسیع رقبہ خریدا اور 530 مربع فٹ پر دو کمروں اور ایک برآمدے پر مشتمل

ایک ہٹ (HUT) بنوایا۔آج کل یہ علاقہ 2020ء میں نئے قائم کردہ کراچی کے ساتویں ضلع کیماڑی کا حصہ ہے۔

مارچ 1948ء میں قائداعظم بطور گورنر جنرل مشرقی پاکستان کے دورے پر تھے۔25 اور 26 مارچ آپ کا قیام چٹا گانگ میں رہا۔جب آپ چٹا گانگ بندرگاہ کے ترقیاتی منصوبے پر بریفنگ کے لیے سمندر پہنچے تو آپ کی نظر بانس سے بنی جھونپڑیوں پر پڑی جو آپ کے دل کو بھا گئیں۔ساتھ ہی بانس سے بنا ایک بنگلہ تھا جو کہ ریلوے کے چیف انجینئر پی زیڈ حسین نے ریلوے ملازمین کی رہائش کے لیے بنوایا تھا۔آپ نے پوچھا کہ اگر وہ ایسا ہی بانس کا بنگلہ کراچی میں ذاتی طور پر بنوانا چاہیں تو کیا خرچ آئے گا۔حسین نے کہا کہ وہ یہ بنگلہ یہیں چٹا گانگ میں تعمیر کروا کے بذریعے سمندر کیماڑی بھجوا کر قائداعظم کی زمین میں نصب کروادے گا۔تعمیر، ترسیل اور تنصیب ملا کر 30 سے 35 ہزار روپے لگ جائیں گے، تاہم بانس کا گھر صرف دس سال کے لگ بھگ عرصہ کے لیے کارآمد ہوگا۔قائداعظم نے پیشگی ادا کر دیا اور تعمیر کا حکم دے دیا۔تاہم چھ ماہ میں قائداعظم انتقال کر گئے۔

گورنر جنرل کے دیکھا دیکھی برطانیہ اور بلجیم کے سفارت کاروں نے کیماڑی میں قائد کے ہٹ کے آس پاس اپنے لیے Huts بنوالیے تاکہ چھٹی کے دن سمندر سے لطف اندوز ہوسکیں۔قائداعظم خود کبھی ایک مرتبہ بھی اپنے ہٹ میں قیام نہ فرما سکے۔فاطمہ جناح کی وفات کے بعد بلی جی میں قائد کی زمین ایک کروڑ 11 لاکھ روپے میں فروخت کر کے رقم قائداعظم ٹرسٹ میں جمع ہوگئی تب ہٹ (HUT) کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔

قائداعظم کی کمرشل جائیداد (کراچی کے دو پلازے)

قیامِ پاکستان کے صرف ایک ماہ بعد قائداعظم کے ایک مشیر نے سندھ مدرستہ الاسلام کے جنوب میں میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ) پہ ایک کمرشل عمارت کی طرف قائداعظم کی توجہ دلائی جو کہ برائے فروخت تھی اور ایک کاروباری فرم میسرز کالا چند موتی رام کی ملکیت تھی۔انہوں نے جنوری 1946ء میں جیمز ولیم اوّل نامی ایک انگریز

سے رقبہ خرید کر سروے نمبر 4/1-A پر عمارت تعمیر کی جبکہ 4/1-B اور 4/1-C خالی پلاٹ کے طور پر چھوڑ دیے۔

قائداعظم نے 2,786 مربع (تقریباً 4 کنال) پر مشتمل 4/1-A پر کھڑی عمارت خریدی تو یہ پاکستان میں پہلا کمرشل پلازا تھا جو ان کی ملکیت میں آیا۔ باقی دونوں خالی پلاٹوں کا رقبہ بالترتیب 800 مربع گز اور 700 مربع گز تھا جو کہ فروخت کنندہ ہی کی ملکیت رہی۔ عمارت میں سپنسر Spencer کمپنی کے گودام تھے جو ماہانہ کرایہ 1,500 روپے قائد اعظم کو ادا کرنے لگے۔ قائد کی وفات کے بعد فاطمہ جناح نے عمارت دادا بھائی نامی معروف کاروباری شخصیت کو فروخت کر دی جنہوں نے 4/1-B اور 4/1-C کے خالی پلاٹ بھی مالکوں سے خرید کر محمدی پلازہ تعمیر کر دیا، جس کا افتتاح 1956ء میں ہوا۔ اس بلڈنگ میں محمدی سٹیم شپ کمپنی کا صدر دفتر قائم ہوا۔ 1971ء میں بھٹو دورِ حکومت میں جہاز رانی کے شعبہ کو قومیائے جانے کے بعد محمدی کمپنی، پاکستان نیشنل شپنگ کمپنی PNSC میں ضم ہوگئی۔ چنانچہ یہ پلازا جو آج بھی قائم ہے، PNSC کی ملکیت میں چلا گیا۔

قائداعظم کے خریدے دوسرے پلازے کی کہانی بھی کچھ ملتی جلتی ہے۔ اوائل 1948ء میں قائداعظم کے دوست شیورتن موہاٹا (موہاٹا محل کا اصل مالک) نے سرائے کوارٹر (میکلوڈ روڈ) پر اپنی بلڈنگ فروخت پر لگا دی کیوں کہ اس کو کاروبار کے لیے کچھ سرمایہ کی ضرورت تھی۔ اس بلڈنگ میں چارٹرڈ بینک آف انڈیا قائم تھا جن سے ماہانہ 7,737 روپے کرایہ آتا تھا اور کرایہ نامہ کی میعاد 31 اگست 1960ء تک کے لیے تھی۔

جون میں قائداعظم، علالت کی وجہ سے کوئٹہ میں مقیم تھے۔ تاہم یکم جولائی کو سٹیٹ بینک کے افتتاح کے لیے آپ کراچی تشریف لائے۔ آپ کے وکیل جناب ایم اے کوتوال کے اصرار پر آپ یہ بلڈنگ خریدنے پر تیار ہوگئے۔ سرکاری مصروفیات کی وجہ سے بلڈنگ دیکھ بھی نہ سکے۔ دس لاکھ دس ہزار روپے میں سودا ہوا۔ 33 ہزار ٹیکس وغیرہ میں لگے اور 25 اگست 1948ء کو بلڈنگ قائداعظم کے نام ٹرانسفر ہوگئی، جب آپ زیارت میں آرام فرما تھے۔ ٹھیک 16 دن بعد قائداعظم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

اگلے سال یعنی 1949ء میں کرایہ دار بینک نے بلڈنگ 16 لاکھ روپے میں خریدنے کی پیشکش کی جو فاطمہ جناح نے قبول کر لی۔ یہ 16 لاکھ قائداعظم ٹرسٹ میں جمع ہوگئے۔ سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک آج بھی اس بلڈنگ میں قائم ہے۔ اور یہ موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ پر محمدی پلازا سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر کھڑی ہے۔

قائداعظم کی مزید ممکنہ جائیداد

درج ذیل دو بنگلے اور چار پلاٹ بھی قائداعظم کی ملکیت ہونے کے بارے میں قیاس آرائیاں ہیں لیکن کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔

(ا) بنگلہ نمبر A-6، فریئر ٹاؤن کوارٹر کراچی میں کلفٹن روڈ اور جہانگیر کوٹھاری کے سنگم پر 10 کنال کا بنگلہ محترمہ رتن شاہ کپاڈیہ سے 150,000 روپے میں خریدنے کا سودا ہوا۔ نہ تو قائداعظم کی جانب سے خرید کا کوئی دستاویزی ثبوت ہے اور نہ ہی قائداعظم کے انتقال کے بعد ٹرسٹ کی جانب سے فروخت کے کوئی شواہد۔ تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان کے اپنے دستخط سے قائداعظم ٹرسٹ کے اجلاس منعقدہ 12 جولائی 1949ء کے جو نکات (Minutes) جاری ہوئے، ان میں اس مکان پر رینٹ کنٹرولر کا نوٹس زیر بحث رہا اور پھر مرمت کے لیے 2,590 روپے کے تخمینے کی منظوری ہوئی۔ اگر یہ بنگلہ قائداعظم کا نہیں تھا تو پھر ٹرسٹ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے گمان ہے کہ قائداعظم نے یہ کبھی خریدا ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ بنگلہ کلفٹن میں غالباً اس جگہ واقع تھا جہاں آج کل پارک ٹاور نامی شاپنگ مال قائم ہے۔

(ب) بنگلہ نمبر 1، سول لائن کراچی (رقبہ 9 کنال) بظاہر خورشید بھائی نوروجی اور گل بائی نوروجی سے خریدا گیا تھا جو غالباً باپ بیٹی تھے۔ قائداعظم نے 5 فروری 1947ء کو -/15,000 روپے کا چیک بطور بیعانہ بھجوا دیا۔ قائداعظم کے وکلا بظاہر اگلے چند ماہ مالکن سے رابطہ کی کوشش کرتے رہے لیکن رابطہ ممکن نہ ہوسکا۔ 3 جون 1947ء کو قیامِ پاکستان کا اعلان ہوا تو قائداعظم بہت مصروف ہوگئے۔ رجسٹری کی ذمہ داری ان کے وکیل ایم اے کوتوال کی تھی، لیکن جب قائد بطور گورنر جنرل کراچی پہنچے تو عدالتیں موسم گرما کی تعطیلات کے باعث

بند تھیں، لہٰذا اُن کے نام انتقال نہ ہوا۔ دریں اثنا بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کراچی نے غیر مسلم مالکان کے لاپتہ ہونے پر مکان کو متروکہ املاک سمجھ کر ضبط کرلیا تو پتا چلا کہ اسے مسٹر جناح خرید چکے ہیں جو پاکستانی شہری ہیں۔ پھر کیا ہوا، راقم الحروف تا حال معلوم کرنے میں ناکام ہے۔

(ج) کلفٹن روڈ پر پلاٹ نمبر F.T-2/16,17,18,19 مشنری چرچ کی ملکیت تھا جو کہ 2,22,000 روپے میں فروخت کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کی طرف سے 10 فیصد یعنی 22 ہزار روپے بیعانہ بذریعہ چیک ادا ہونے کا ثبوت تو قائداعظم پیپرز اسلام آباد میں موجود ہے، لیکن بقایا رقم کی ادائیگی یا اس بیعانہ کی واپسی کا کوئی حوالہ یا دستاویز نہیں۔ اس لیے یہ تعین کرنا کہ چرچ کی انتظامیہ سے یہ چاروں پلاٹ خرید لیے گئے تھے یا نہیں، ابھی تحقیق طلب ہے۔

حاصل کلام

جیسا کہ ضمیمہ (د) میں موہاٹا پیلس کے ضمن میں ذکر آئے گا کہ قائداعظم کے ذاتی کاغذات و دستاویزات محترمہ فاطمہ جناح کے سپرد تھے۔ جب 1967ء میں محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال ہوا تو موہاٹا محل میں محترمہ شیریں جناح رہنے لگیں۔ پھر ان کی وفات پر خاندانی مقدمات کے باعث 1980ء میں عدالتی حکم پر محل کی تالہ بندی ہوگئی۔ 1995ء میں جب تالہ توڑا گیا تو کمروں میں کاغذات بکھرے پڑے تھے اور بہت سے لفافے خالی تھے یعنی اس کے دستاویز غائب کردیے گئے تھے۔ قائداعظم جو ہر سرکاری کاغذ وغیرہ سنبھال کر رکھتے تھے، وہ سب اِدھر اُدھر ہوگئے اور یہ جائیدادیں کس کے ہاتھ گئیں، کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک تحقیقی کمیشن بنایا جائے جو تمام جائیداد کا سراغ لگائے اور اگر کوئی جائیداد ناجائز طور پر ہتھیائی گئی ہے تو اسے واگزار کروا کر نیلام کردیا جائے اور قائداعظم کی خواہش کے مطابق رقم تعلیمی اداروں کو ادا کردی جائے۔

باب 8

قائداعظم کے بینک اکاؤنٹس میں دولت

جیسا کے پوری کتاب میں ذکر ہورہا ہے کہ قائداعظم کی دولت کے ذرائع متفرق اور متنوع تھے۔ جائیداد کی خرید و فروخت، کرایہ کی مد میں آمدنی، صنعتی سرمایہ کاری اور حصص کی خرید و فروخت سے حاصل شدہ منافع وغیرہ، ان کی وکالت کی آمدنی کے علاوہ تھا۔ اس کے لیے مختلف اوقات میں بہت سارے بینکوں میں کھاتے رکھنے پڑے۔ تحقیق سے برطانیہ میں قائد اعظم کے چار بینک کھاتوں کا پتہ چلا جو کہ چار مختلف اوقات میں مختلف وجوہات کی بنا پر کھولے گئے۔ غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کے چار بینک اکاونٹ تھے، دو بمبئی میں اور دو دہلی میں۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اُنھوں نے وہ چاروں کھاتے بند کروا کے، انہی چاروں بینکوں کی کراچی کی برانچوں میں کھاتے کھلوا کر اپنا تمام پیسہ پاکستان منتقل کروالیا۔ اس طرح پوری زندگی میں آپ کے بارہ بینک اکاؤنٹ بنتے ہیں۔ ان تمام رقوم کو جو کہ منقولہ جائیداد (Moveable assets) یا نقد دولت (Liquid Wealth) کے ضمن میں آتی ہے، آپ اکثر اوقات سرمایہ کاری کے لیے استعمال فرماتے اور باقاعدگی سے منافع پر ٹیکس ادا کرتے رہتے۔

برطانیہ میں چار بینک کھاتے

جب قائداعظم زمانہ طالب علمی میں یعنی 19 ویں صدی کے اواخر میں اپنا پہلا بینک اکاؤنٹ کھلوایا تو اکاؤنٹ نمبر کا رواج نہ تھا بلکہ ہر اکاؤنٹ اپنے ٹائٹل یعنی کھاتے دار

کے نام سے شناخت ہوتا تھا، اس لیے قائداعظم کا اکاؤنٹ نمبر تلاش کرنا ایک بے معنی عمل ہوکر رہا جاتا ہے۔

(1) **رائل بینک آف سکاٹ لینڈ (RBS)** کی برانچ واقع 123- بشپ گیٹ لندن میں 1893ء میں آپ کی زندگی کا پہلا اکاؤنٹ کھلا جہاں گھر سے لائے پیسے جمع کروائے۔ یہیں سے آپ نے لنکز اِن کی فیس کی مد میں 138 پونڈ 19 شیلنگ نکلوا کر ادارے میں داخلہ لیا اور اسی اکاؤنٹ سے آپ اپنی مالکن مکان کو ہفتہ وار ایک پونڈ 10 شیلنگ کرایہ نکلوا کر ادا کرتے رہے۔ جب 1896ء میں تعلیم مکمل کر کے واپس روانہ ہوئے تو 71 پونڈ کی رقم بقایا تھی جو آپ نے نیشنل بینک آف انڈیا کی بمبئی برانچ میں ترسیل کرنے کی ہدایت کر دی۔

(2) **نیشنل بینک آف انڈیا** کی بشپ گیٹ برانچ لندن میں آپ نے یہ اکاؤنٹ اپنی شادی کے بعد اہلیہ محترمہ کے ساتھ برطانیہ کے پہلے دورے میں یعنی 1919ء میں کھلوایا۔ بیگم مریم جناح اس وقت حمل سے تھیں اور برطانیہ میں ہی اسی سال 14 اگست کو قائداعظم کی اکلوتی بیٹی دینا جناح پیدا ہوئیں۔ طبی اخراجات کے علاوہ بیگم صاحبہ شاپنگ یعنی خریداری کی رسیا تھیں، لہٰذا قائداعظم نے اسی بینک کی بمبئی برانچ کے اپنے اکاؤنٹ سے رقم منتقل کر کے یہ کھاتہ لندن میں ایکٹو کروالیا۔ قائداعظم کے شادی شدہ سالوں میں بیگم صاحبہ اکثر انگلستان تشریف لاتیں اور اسی کھاتے سے رقم استعمال کرتیں۔ لہٰذا 22-1921ء میں اس کا اوسط بیلنس ہمیشہ تین ہزار پونڈ سے اوپر ہوتا۔ 1927ء میں بیگم صاحبہ کی بیماری اور دو سال بعد وفات کے باعث یہ کھاتہ غیر مستعمل ہوگیا اور رقم محض پانچ شیلنگ رہ گئی۔ پھر اکاؤنٹ منجمد ہوگیا۔

(3) **لائیڈز بینک بروک سٹریٹ** کا کھاتہ آپ نے 1931ء میں کھلوایا تھا۔ قبل ازیں آپ کی اہلیہ کی وفات، ہندو مسلم اتحاد کوششوں میں ناکامی اور لارڈ ولنگڈن کے وائسرائے بننے سمیت مختلف وجوہات سے قائداعظم دلبرداشتہ ہو گئے اور اپنے تئیں ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر برطانیہ آ گئے تھے۔ آپ پریوی کونسل میں وکالت کی پریکٹس کرنے لگے اور اپنی آمدنی کی لیے یہی اکاؤنٹ استعمال میں رکھا کیوں کہ یہ کنگ واک پر واقع آپ کے

وکالت کے چیمبر سے زیادہ دُور نہ تھا۔ 17 اگست 1934ء پر ہندوستان واپسی کے فیصلہ پر آپ نے ویسٹ ہیتھ ہاؤس نامی بنگلہ 10,000 پونڈ میں فروخت کیا تو وہ رقم بھی نیشنل بینک کے توسط سے اسی اکاؤنٹ میں جمع ہوئی جس سے آپ نے 3 فیصد سالانہ منافع پر وکٹری بونڈ خرید لیے۔

(4) **لارڈ نیشنل پراونشل بینک لمیٹڈ**، لندن میں کھاتہ 1936ء میں کھولا گیا اور قائداعظم کی وفات تک رہا لیکن کوئی خاص ترسیلات نہ ہوئیں۔ 1946ء میں کھاتے کا میزانیہ محض پانچ پونڈ تھا۔

بہرطور قیام پاکستان کے وقت لندن کے کھاتوں میں 4,999 پونڈ موجود تھے جن میں سے 1,000 پونڈ آپ نے مسلم انڈیا انفارمیشن سینٹر لندن کو عطیہ کیا اور باقی 3,999 پونڈ نیشنل بینک آف انڈیا کی کراچی برانچ میں بھجوا دیئے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

غیر منقسم ہندوستان میں چار بینک کھاتے

قائداعظم کے بمبئی میں دو اکاؤنٹ اپنی ذاتی آمدنی کے لیے تھے۔ جب آپ برصغیر کے افق پر چھا گئے تو قومی سطح کے رہنما کے طور پر آپ کا بیشتر قیام دہلی میں رہنے لگا جس کے لیے وہاں آپ نے 10 اورنگزیب روڈ والا مکان بھی خریدا، دو ذاتی اکاؤنٹ کھلوائے اور مزید یہ کہ مسلم لیگ فنڈ اور پاکستان فنڈ کے لیے بھی بینکوں میں کھاتے کھلوائے۔

(5) **نیشنل بینک آف انڈیا، بمبئی** برانچ میں آپ کا اکاؤنٹ آپ کی سرکاری ملازمت میں مجسٹریٹ کی نوکری کے دوران آپ کی تنخواہ کے کام بھی آتا تھا اور برطانیہ تعلیم کے بعد 71 پونڈ کی بقایا رقم بھی یہیں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے 30 جون 1947ء کو آپ نے یہاں کا بقایا بیلنس 1,35,000 روپے اکاؤنٹ بند کروا کے اسی بینک کی کراچی برانچ میں اکاؤنٹ کھلوا کر جمع کروائی جس کا ذکر نیچے سیریل نمبر 9 میں آئے گا۔

(6) **امپریل بینک آف انڈیا بمبئی**، میں آپ کے کھاتوں کے لیجر فولیو Ledger Folio 1931ء سے بعد کے دستیاب ہیں۔ ہر سال کا لیجر نمبر الگ ہوتا تھا، اس لیے کوئی

مستقل کھاتہ نمبر دستیاب نہیں ۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے جاری (کرنٹ) اور سیونگ (بچت) کھاتوں میں ملا کر 86,161 روپے، 3 آنہ 4 پائی کی رقم تھی جو اس بینک کی کراچی برانچ میں 31 مارچ 1948ء کو منتقل ہوگئی، جس کا ذکر نیچے سیریل 10 میں آئے گا۔ اس اکاؤنٹ میں قائداعظم کے 20 لاکھ 30 ہزار روپے کے Fixed Deposit سرٹیفکیٹ بھی اس کے علاوہ تھے جو حبیب بینک کراچی میں جمع ہوئے۔ (دیکھئے درج ذیل سیریل نمبر 12)۔

اسی امپریل بینک آف انڈیا ہی کی دہلی برانچ میں قائداعظم کا سرمایہ اکاؤنٹ نمبر 1920 کے ذریعے روزنامہ ڈان ٹرسٹ اور سول ڈیفنس کمیٹی کے لیے جمع تھا۔ لیجر فولیو 693 کے ذریعے 3 لاکھ 9 ہزار روپے کی رقم اور اڑھائی لاکھ روپے سے زیادہ کے خاص ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ اس کے علاوہ تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد حبیب بینک کراچی (دیکھئے سیریل نمبر 12) میں جمع ہوئے۔

(7) **سینٹرل بینک آف انڈیا**، دہلی میں آپ کا اکاؤنٹ تو کوئی نہیں تھا لیکن 1942ء میں ڈیڑھ لاکھ روپے اور 1946ء میں مزید ایک لاکھ روپے کے خاص ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ آپ نے خرید رکھے تھے۔ 27 اپریل 1948ء کو اڑھائی لاکھ روپے کے یہ F.D. سرٹیفکیٹ، حبیب بینک کراچی برانچ میں قائداعظم کے لون اکاؤنٹ میں جمع ہوئے۔

(8) **حبیب بینک لمیٹڈ** کی دہلی برانچ میں قائداعظم کا ذاتی اکاؤنٹ تو اپنی تین شادی شدہ بہنوں اور بیٹی کو ماہانہ خرچ دینے کے لیے کھولا گیا تھا جس کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ البتہ پارٹی کے تمام اکاؤنٹ اسی بینک میں تھے کیوں کہ یہ بینک ایک مسلمان کمپنی کی ملکیت تھا، مثلاً اکاؤنٹ 2324 پاکستان فنڈ، اکاؤنٹ نمبر 2323 قائداعظم پرسنل ڈونیشن فنڈ، اکاؤنٹ نمبر 1919 قائداعظم ایجوکیشن فنڈ، اکاؤنٹ 2325 بہار ریلیف فنڈ اور اکاؤنٹ 1389 مسلم لیگ فنڈ کے عطیات کے لیے تھا۔ بہار ریلیف فنڈ میں قائداعظم کے ذاتی 36 لاکھ روپے کے بونڈ تھے جو کہ حبیب بینک کراچی کے لون اکاؤنٹ میں آزادی کے فوراً بعد منتقل ہوئے۔

کراچی کے سابق میئر سہراب کٹرک جن سے قائداعظم نے جناح منزل کراچی خریدی

قائداعظم کے دوست رام کرشنا ڈالمیا اور ان کی نوجوان پانچویں بیوی مشہور شاعرہ نندینی ڈالمیا اسی جوڑے نے قائداعظم سے جناح منزل دہلی خرید لی تھی

ماہر تعلیم لالہ شیو دیال سیٹھ جو بلدیہ ریکارڈ کی رُو سے جناح منزل لاہور کے رقبے کے پہلے مالک تھے

مشہور بیوروکریٹ ہاشم رضا سی ایس پی نے بطور ایڈمنسٹریٹر کراچی قائداعظم کی وفات پر ان کی جائے تدفین کا انتخاب کیا جہاں آج مزارِ قائد واقع ہے

آرکیٹیکٹ ایڈون لیوٹن جس نے لیوٹنز دہلی کا علاقہ
ڈیزائن کیا جہاں جناح منزل دہلی واقع ہے

آرکیٹیکٹ کلاڈ بائلے جس نے پرانے ساؤتھ کورٹ کی
جگہ بمبئی میں نئی جناح منزل ڈیزائن کی

جودھ پور (موجودہ بھارت) کا مشہور مسلمان آرکیٹیکٹ
آغا احمد حسین جس نے کراچی کا موہاٹا محل ڈیزائن کیا

کراچی کا یہودی برادری سے تعلق رکھنے والا آرکیٹیکٹ
موسیٰ سمو کے جس نے جناح منزل کراچی کو ڈیزائن کیا

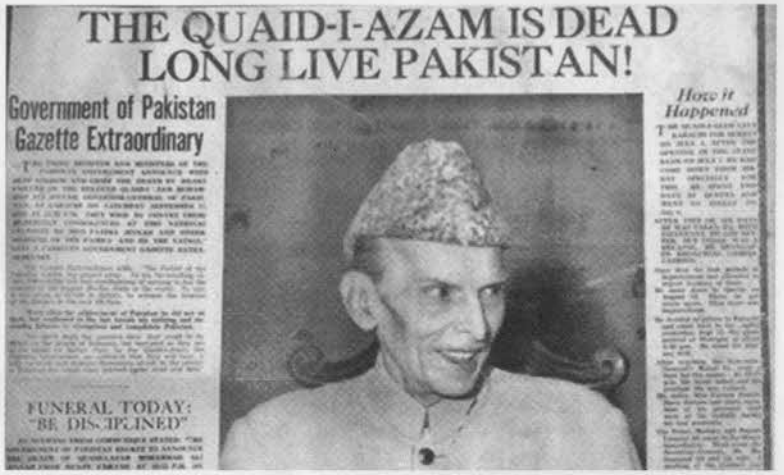
THE QUAID-I-AZAM IS DEAD
LONG LIVE PAKISTAN!
Government of Pakistan
Gazette Extraordinary
How it Happened
FUNERAL TODAY:
"BE DISCIPLINED"

قائداعظم کے انتقال کی خبر کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں

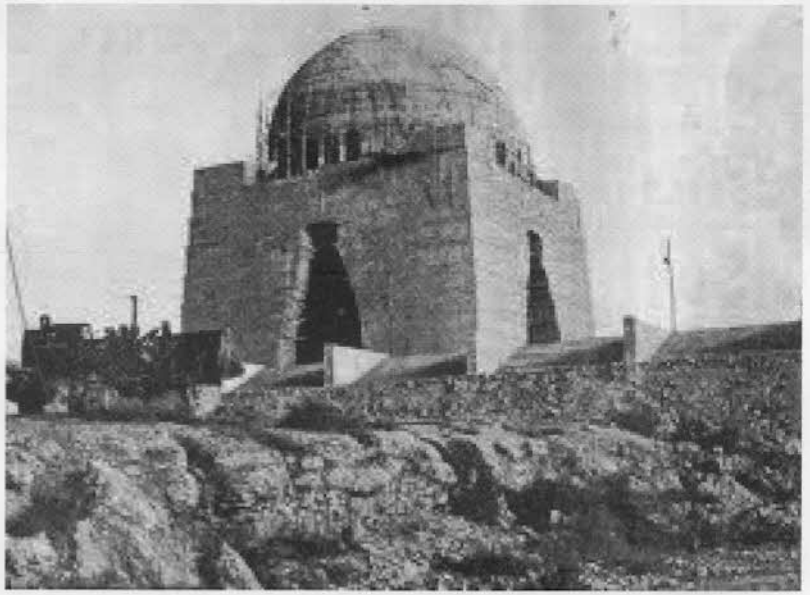

مزارِ قائد کی دورانِ تعمیر کی ایک تصویر

ویسٹ ہیتھ ہاؤس، لندن کے علاقہ ہیمپسٹیڈ ہیتھ میں ایک شاندار بنگلہ ہوا کرتا تھا۔ قائداعظم، فاطمہ جناح اور دینا جناح یہاں 1930ء تا 1934ء مقیم رہے۔ اسی سال آپ نے ہندوستان واپسی پر 10 ہزار پونڈ میں یہ بنگلہ فروخت کر ڈالا

کور کمانڈر ہاؤس لاہور کے باہر ناکہ بندی کی گئی ہے۔ گیٹ کے دونوں اطراف نمائشی توپیں ہیں۔ یہ بنگلہ کبھی قائداعظم کی ملکیت تھا

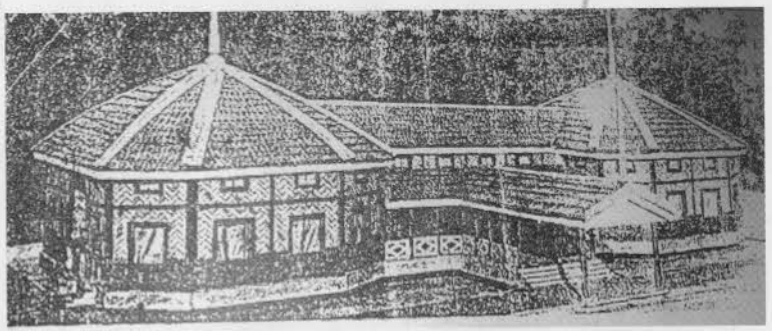

کیماڑی کے گابو پٹ ساحل پر بُلی جی نامی گاؤں کے باہر قائداعظم کا ذاتی ہٹ (Hut)
جہاں آپ اپنی مصروفیات کی وجہ سے ایک دن بھی قیام نہ کر پائے

کراچی کا محمدی شپنگ کمپنی پلازا، یہ رقبہ سروے نمبر A-1/4 کہلاتا تھا اور اس پر قائم عمارت قائداعظم کی ذاتی ملکیت تھی

1948ء میں مہتہ بلڈنگ کا ایک منظر جو قائداعظم نے خرید لی تھی۔ یہ عمارت کراچی
کی آئی آئی چندریگر روڈ پر آج بھی قائم ہے جہاں سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک کا دفتر ہے

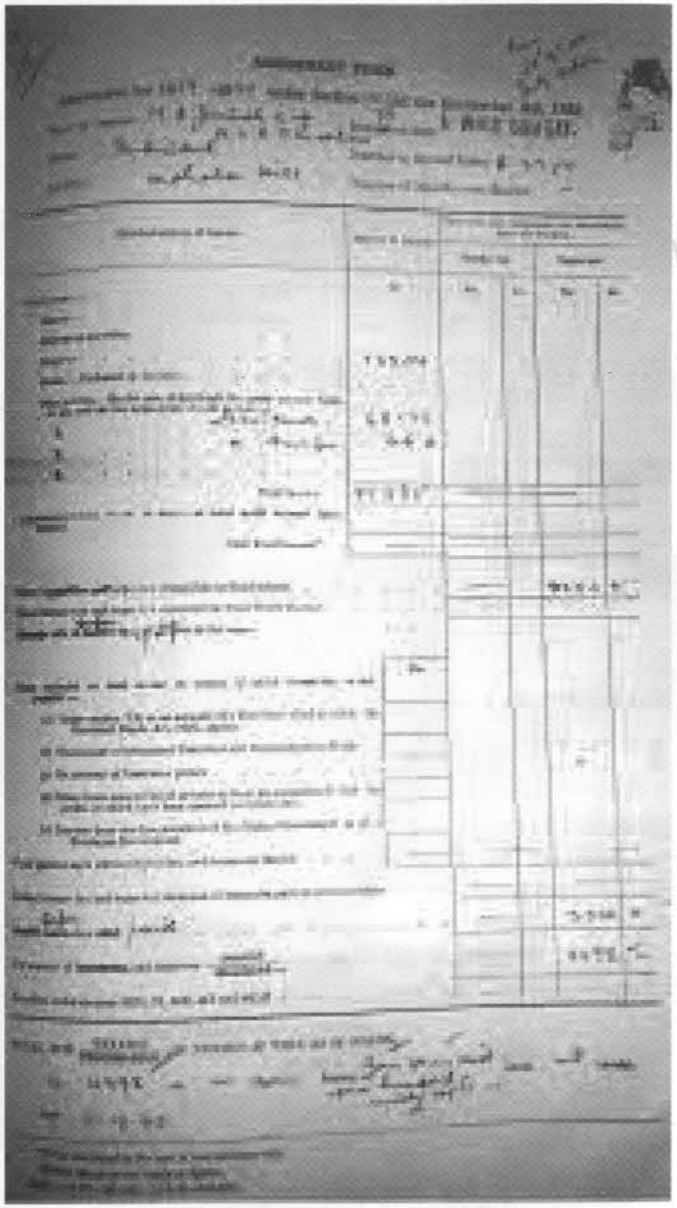

مالی سال 40-1939ء کے لیے قائداعظم کا ٹیکس گوشوارہ

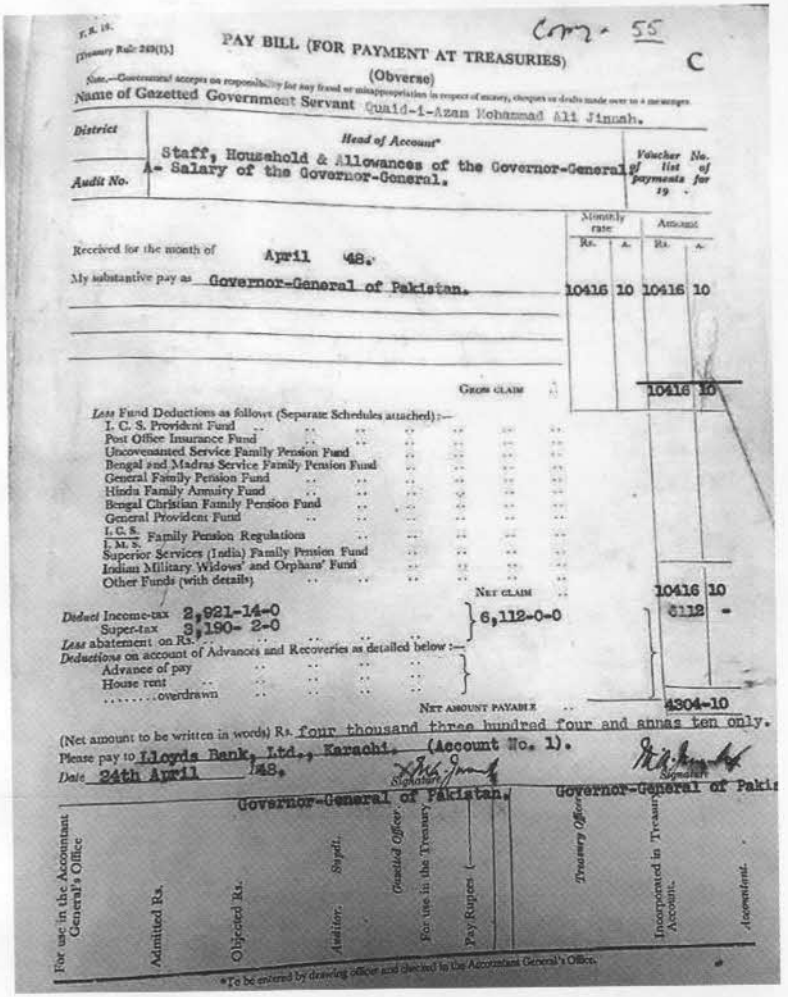

F. R. 16.
[Treasury Rule 249(1).]

Corr. 55

PAY BILL (FOR PAYMENT AT TREASURIES)

C

(Obverse)

Note.—Government accepts no responsibility for any fraud or misappropriation in respect of money, cheques or drafts made over to a pay merger.

Name of Gazetted Government Servant Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah.

District

Audit No.

Head of Account*
Staff, Household & Allowances of the Governor-General
A- Salary of the Governor-General.

Voucher No. of list of payments for 19 .

Received for the month of April 48.

	Monthly rate Rs.	a.	Amount Rs.	a.
My substantive pay as Governor-General of Pakistan.	10416	10	10416	10
Gross claim			10416	10

Less Fund Deductions as follows (Separate Schedules attached):—
I. C. S. Provident Fund
Post Office Insurance Fund
Uncovenanted Service Family Pension Fund
Bengal and Madras Service Family Pension Fund
General Family Pension Fund
Hindu Family Annuity Fund
Bengal Christian Family Pension Fund
General Provident Fund
I. C. S. / I. M. S. Family Pension Regulations
Superior Services (India) Family Pension Fund
Indian Military Widows' and Orphans' Fund
Other Funds (with details)

Net claim 10416 10

Deduct Income-tax 2,921-14-0
Super-tax 3,190- 2-0 } 6,112-0-0 — 6112 -

Less abatement on Rs. .....

Deductions on account of Advance and Recoveries as detailed below :—
Advance of pay
House rent
.....overdrawn

Net amount payable 4304-10

(Net amount to be written in words) Rs. four thousand three hundred four and annas ten only.

Please pay to Lloyds Bank, Ltd., Karachi. (Account No. 1).

Date 24th April 48.

Signature Governor-General of Pakistan.

Signature Governor-General of Pakis

For use in the Accountant General's Office
Admitted Rs.
Objected Rs.
Audit.
Audit.
Gazetted Officer
For use in the Treasury
Pay Rupees (
Treasury Officer
Incorporated in Treasury Account.
Accountant.

*To be entered by drawing officer and checked by the Accountant General's Office.

قائداعظم کی بطور گورنر جنرل پاکستان تنخواہ نامہ (Pay Slip)

پاکستان میں آزادی کے وقت کھولے گئے چاروں بینک اکاؤنٹ

قائداعظم نے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اپنا تمام تر سرمایہ پاکستان میں لانے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان میں موجود چاروں کھاتے (اوپر سیریل نمبر 5 تا 8) بند کروا دیے اور ان میں موجود تمام پیسہ انہی چاروں بینکوں کی کراچی کی شاخوں کو منتقل کر دیا گیا۔

(9) نیشنل بینک آف انڈیا (کراچی برانچ) کا آغاز تو اسی بینک کی بمبئی برانچ (سیریل نمبر 5) کے بقیہ 1,35,000 روپے سے ہوا، لیکن کچھ ہی عرصہ میں جناح منزل دہلی کی فروخت سے 2,90,000 روپے یہاں جمع ہوئے اور پھر انھوں نے بمبئی الیکٹرک سپلائی کمپنی کے دو ہزار حصص بھی فروخت کر دیے تو 2,61,710 روپے مزید آ گئے۔ بینک کا منافع ڈال کر 31 دسمبر 1947ء کو کھاتہ کا آخری میزانیہ (Closing Balance) مبلغ 6,95,767 روپے تھا۔ چوں کہ قائداعظم نے کراچی میں محمدی بلڈنگ والے پلازا کی رقم خرید مبلغ 2,85,000 روپے اور بنگال سٹیل کارپوریشن کے 60 ہزار روپے مالیت کے حصص کی خریداری کی رقم اسی کھاتے سے ادا کی، لہٰذا اکاؤنٹ بیلنس گھٹتا بڑھتا رہا۔ سب سے حیرت انگیز ادائیگی 7 جولائی 1948ء کو آپ کی وفات سے چند ہفتے قبل، شاہِ مصر کے نام 2,683 پونڈ کا چیک اور شاہِ اردن کے نام 1,000 پونڈ کا چیک ہے۔ 270 روپے بینک چارجز نقد ادا ہوئے۔ یہ کیا معاملہ تھا کہ قائداعظم نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے دو بادشاہوں کو عطیہ کے چیک دیے، اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔

(10) لائیڈز بینک کراچی کا اجراء 66,666 روپے کے ایک چیک جمع ہونے سے ہوا۔ اس کے علاوہ لائیڈز بینک کی لندن برانچ سے جو 3999 پونڈ، جن کا اوپر ذکر ہوا، بھی یہاں جمع ہوئے تو پاکستانی روپے میں یہ 62,764 روپے بنے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے کھاتوں سے مزید 7,05,483 روپے یہاں جمع ہوئے۔ بینک آف انڈیا (کراچی برانچ) سے بھی بذریعہ پے آرڈر 5,20,000 روپے یہاں منتقل ہوئے۔ مسلم لیگ فنڈ کی پاکستان مسلم لیگ اور انڈیا مسلم لیگ میں تقسیم کے وقت قائداعظم نے ایک چیک 6,00,000 روپے اور دوسرا 1,50,000 روپے کا اسی اکاؤنٹ سے کاٹا۔ پھر بھی آپ کے انتقال کے وقت

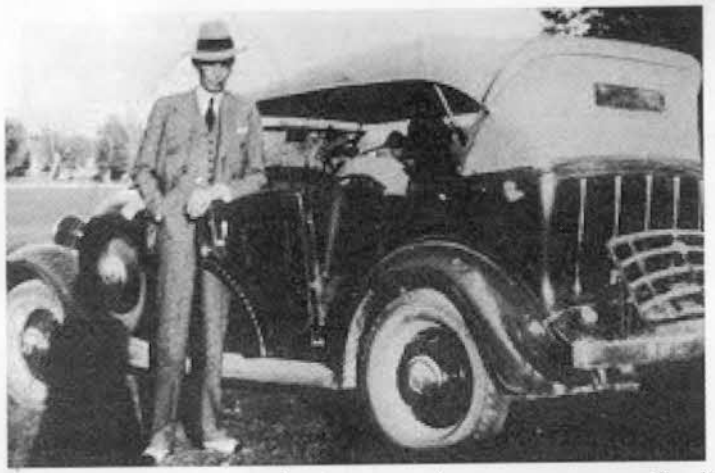

قائداعظم اور بیگم جناح نے یہ convertible لیموزین 1920ء کی دہائی میں خریدی۔ علاوہ ازیں آپ نواب آف بہاولپور کی جس Royce Rolls میں گورنر جنرل پاکستان کا حلف اٹھانے تشریف لائے۔ اس کی تصویر اس کتاب کے سرورق پر ہے

قائداعظم پانچ لگژری گاڑیوں کے مالک تھے۔ یہ سفید 1938ء ماڈل کی پیکرڈ (Packard) مزار قائد کے میوزیم کی زینت ہے

آپ کی باقی چار کاریں شیورلٹ (Chevrolet)، سن بیم (Sunbeam)، کیڈلک (Cadillac)، اور گراہم پیج (PaigeGraham) اپنے دور کے قیمتی ترین گاڑیوں کے برینڈ تھے

اس میں 6 لاکھ سے کچھ اوپر رقم بقایا تھی۔ بطور گورنر جنرل آپ کی ماہوار تنخواہ اسی بینک میں کریڈٹ ہوتی تھی۔

(11) **بینک آف انڈیا**، کراچی برانچ میں ہندوستان کے اسی بینک میں موجود آپ کی بقایا رقم منتقل ہوئی تھی۔ یہاں سے 5,20,000 روپے بذریعہ پے آرڈر لائیڈز بینک میں گئے جس کا اوپر سیریل نمبر 10 ذکر ہو چکا ہے۔ آپ کے انتقال کے وقت اس بینک میں آپ کا بیلنس صرف 5,643 روپے 2 آنہ ہی بچا تھا۔

(12) **حبیب بینک آف انڈیا**، کراچی اس لیے سب سے اہم ہے کہ قائداعظم کے تمام سرکاری اکاؤنٹ اسی بینک کی دہلی برانچ سے یہاں منتقل ہوئے، جن کا ذکر سیریل نمبر 8 میں آچکا ہے۔ بہار ریلیف فنڈ کے 36 لاکھ روپے کے GP Notes بھی یہاں جمع ہوئے۔ اسی طرح امپیریل بینک آف انڈیا، بمبئی برانچ سے 20 لاکھ 30 ہزار روپے اور دہلی برانچ سے اڑھائی لاکھ کے خاص ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ بھی یہیں جمع ہوئے۔ ان میں سینٹرل بینک آف انڈیا (سیریل نمبر 7) کے اڑھائی لاکھ کے سرٹیفکیٹ (FD سرٹیفکیٹ) مزید جمع ہوئے تو کُل مالیت 25 لاکھ بن گئی۔ چوں کہ GP Notes کے 36 لاکھ اور FD Notes کے 25 لاکھ قائداعظم کے ذاتی تھے، اس لیے 2 فروری 1948ء کو ان کو زرضمانت Colateral کے طور پر جمع کروا کر آپ نے 61 لاکھ روپے قرضہ حاصل کیا اور 35 لاکھ 35 ہزار روپے پاکستان مسلم لیگ کے حوالے کر دیے۔ 4 اگست 1948ء کو قائداعظم نے خرابی صحت کی بنا پر بینک سے قرضے کی منسوخی کی استدعا کی اور نہ صرف پورے 61 لاکھ روپے بینک کو واپس کر دیے بلکہ بینک نے 1,07,658 روپے 12 آنہ، 2 فروری تا 4 اگست کا سود بھی وصول کیا۔ یہ 61 لاکھ روپے بعد میں قائداعظم کے ترکے کے طور پر ٹرسٹ فنڈ کا حصہ بنے اور تعلیمی اداروں میں تقسیم ہونے تھے، جس کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔

باب 9

قائداعظم کی صنعتی سرمایہ کاری اور سٹاک حصص

دنیا کی سات طاقتور اقوام جن کو G-7 کہا جاتا ہے، اپنی اقتصادی اور صنعتی ترقی کی وجہ ہی سے اتنی مضبوط اور خوش حال ہیں۔ صنعتی ترقی ہی ملکی خوش حالی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ صنعتیں اپنی وسعت کے لیے عام شہریوں کی طرف سے سرمایہ کاری کی متقاضی ہوتی ہیں، اسی لیے سٹاک ایکسچینج کے ذریعے کمپنیوں کے حصص بیچے جاتے ہیں۔ کمپنی کو سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے اور عام لوگ حصص خرید کر اسی تناسب سے منافع میں شریک ہو جاتے ہیں۔ قائداعظم کو قومی ترقی کے لیے صنعتی میدان میں ترقی کی اہمیت کا ہمیشہ سے ادراک تھا۔ بطور گورنر جنرل پاکستان بھی آپ اپنی تقاریر میں صنعتی ترقی اور اس میں نجی شعبہ کو شریک عمل رکھنے پر زور دیتے رہے۔

آپ نے خود صنعتی سرمایہ کاری صرف 36 برس کی عمر میں شروع کی جب 1912ء میں Simplex Mill نامی ایک کمپنی نے 800 کپڑے کی کھڈیاں لگانے کے لیے 15 لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی دعوت دی۔ کمپنی نے اپنے 6,000 حصص 250 روپے فی حصہ فروخت پر لگا دیے۔ قائداعظم نے ایک لاکھ 25 ہزار روپے میں 500 حصص خرید ڈالے۔ اس طرح آپ کمپنی کے پانچ سب سے بڑے حصہ داروں میں شامل ہو کر پانچ رکنی مجلس نظامت یعنی بورڈ آف ڈائریکٹرز کا حصہ بن گئے، جہاں آپ کا نام تیسرے نمبر دکھائی دیتا ہے۔ اسی سے 1912ء ہی میں آپ کی مالی حالت کا بخوبی

اندازہ ہو جاتا ہے۔

1927ء سے سالانہ شائع ہونے والی سرمایہ کاری پاس بک سے ظاہر ہوتا ہے کہ تب تک آپ کی سرمایہ کاری 11 کمپنیوں میں ہو چکی تھی اور ان میں حصص کی مجموعی تعداد 7,323 تھی۔ یہ پاس بک، نیشنل بینک آف انڈیا شائع کرتا تھا۔ بعد کے سالوں میں قائداعظم کی ٹیکس دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ 1936ء میں صرف سرمایہ کاری میں منافع سے آپ کی آمدن 28,490 روپے ہوئی تھی۔ 1937ء اور 1938ء میں بالترتیب 40,825 روپے اور 56,000 روپے صنعتی منافع کی مد میں آپ نے کمایا۔

جنگ عظیم دوئم کے دور میں جب کمپنیوں کے حصص کی قیمتیں گریں تو آپ نے صنعتی شعبہ میں بیش بہا سرمایہ کاری کی۔ 1943ء میں تازہ سرمایہ کاری میں آپ نے 2,03,773 روپے، 1944ء میں 2,13,990 روپے اور 1945ء میں 3,75,105 روپے کے نئے حصص مختلف کمپنیوں میں خریدے۔ یہاں ضمناً حادثے کا ذکر برمحل ہے، ہوا یوں کہ 1944ء میں آپ نے عثمان شاہی مل کے اپنے دس حصص فروخت کے لیے بذریعہ ڈاک بھیجے۔ راستے میں مدراس میل نامی ریل گاڑی کو آگ لگ گئی جس میں سینکڑوں لوگوں کا سامان جل کر خاکستر ہو، وہیں آپ کے حصص کے سرٹیفکیٹ بھی لقمہ آتش بن گئے۔

آپ کی سرمایہ کاری مانجکی پٹیٹ کمپنی میں بھی تھی جس کی ملکیت آپ کے برادرانِ نسبتی (یعنی بیگم مریم جناح مرحومہ کے بھائیوں) کے پاس تھی۔ اسی طرح آپ کے حصص بمبئی ڈائنگ میں بھی تھے جس کی ملکیت آپ کے سمدھی نیس واڈیا اور داماد نیول واڈیا کے پاس تھی۔ تاہم جب آپ کی بیٹی نے نافرمانی کر کے واڈیا خاندان میں شادی کی تو آپ نے کمپنی سے اپنے حصص فروخت کر ڈالے تاکہ بلاوجہ واڈیا خاندان سے آمنا سامنا نہ ہو۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی قائداعظم نے بھارت میں رہ جانے والی کمپنیوں میں اپنے حصص بیچ ڈالے، مثلاً بمبئی الیکٹرک سپلائی اینڈ ٹرام وے کمپنی کے 2 ہزار حصص 60 ہزار روپے میں بیچے تو یہ رقم نیشنل بینک آف انڈیا کراچی برانچ میں آپ کے اکاؤنٹ

میں آئی جس کا ذکر پچھلے باب میں کیا گیا ہے۔ قراردادِ پاکستان کے بعد کے سالوں میں آپ کی بیشتر سرمایہ کاری مسلمان صنعت کاروں کی کمپنیوں میں ہوتی رہی اور آپ نے عثمان شاہی ملز، حیدرآباد سٹیٹ بینک، سرپور پیپر مل، اعظم چائے مل، سٹیل کارپوریشن آف بنگال اور کراچی الیکٹرک سپلائی کمپنی (KESC) میں مذکورہ حصص خریدے۔

قائداعظم کی زندگی کے کے آخری دنوں میں آپ کی ہدایت پر آپ کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے بینکوں سے آپ کی سرمایہ کاری کی تفصیلات طلب کیں تو حبیب بینک کراچی نے 14 جولائی 1948ء کو فہرست میں دس کمپنیوں میں قائداعظم کے 7,604 حصص ظاہر کیے۔ نیشنل بینک کراچی نے 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کی وفات سے چند گھنٹے قبل فہرست میں 7 کمپنیوں کے 9,353 حصص کا ریکارڈ فراہم کیا۔ 3 دسمبر 1948ء کی ضمنی فہرست میں قائداعظم کے پانچ دیگر کمپنیوں میں 2,530 حصص کی دستاویز فاطمہ جناح کو فراہم کی گئیں۔

قائداعظم نے اپنی وصیت میں بہت سے حصص اور زیورات (جن کی مالیت اُس وقت 28 لاکھ روپے سے زائد تھی) اپنی بہن فاطمہ جناح کے نام کیے تھے جو کہ فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد فروخت کر کے تعلیمی اداروں کے نام وقف فنڈ میں شامل ہو جانے تھے۔ یہ کہاں تک ممکن ہو پایا، اگلے ابواب میں اس پر بات ہوگی۔

باب 10

قائداعظم کے آڈٹ اور ٹیکس سے متعلق امور

قائداعظم نے تمام عمر بہت کمایا اور حق حلال کا کمایا۔ آپ اور آپ کے اہلِ خانہ نے اس پاک کمائی سے اچھی کشادہ رہائش رکھی، جدید گاڑیوں میں سفر کیا اور خوش پوشاکی کا شوق پورا کیا۔ لیکن آپ نے زندگی میں کبھی نمود و نمائش کی اور نہ ہی فضول خرچی کی۔ قائداعظم اپنے گھروں کی فاضل بتیاں بجھا دیتے تاکہ بجلی کا بل زیادہ نہ آئے اور اپنے بنگلوں کے باغات کے لیے فلٹر شدہ فاضل پانی استعمال کرواتے تاکہ کنویں کا صاف پانی گھریلو اخراجات کے لیے سال ہا سال دستیاب رہے۔

آپ ہر سال اپنی کل آمدنی اور اخراجات کی ذاتی طور پر پڑتال کرتے اور اپنے ہاتھ سے گوشوارے بناتے جس کو بہر طور انٹرنل آڈٹ کہا جا سکتا ہے۔ پھر آپ سالانہ کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ فرم سے بھی اپنی دولت، اخراجات اور ٹیکس کی ادائیگیوں کا آڈٹ کرواتے۔ مسلم لیگ کے فنڈ ہمیشہ الگ کھاتوں میں رکھواتے اور اچھی ساکھ کی حامل کمپنیوں سے اس کا بھی آڈٹ کرواتے۔

قائداعظم تمام عمر اپنی کمائی پر ٹیکس گزار رہے جس میں کئی اقسام کے مرکزی ٹیکس (جیسا کہ آمدنی ٹیکس)، صوبائی ٹیکس (جیسا کہ پراپرٹی ٹیکس) اور بلدیاتی محصولات (مثلاً واٹر ریٹ یا آبیانہ وغیرہ) ادا کرتے رہے۔ 1931ء میں آمدن کی مد میں 1,177 روپے 10 آنے، 1932ء میں 1,470 روپے، 1935ء میں 17,754 روپے، 1937ء میں

4,877 روپے 8 آنے، جبکہ مالی سال 40-1939ء کا آمدن ٹیکس 4,998 روپے ادا کیا۔ آخر الذکر ٹیکس ریٹرن کا عکس اسی کتاب کے تصاویر کے صفحات پہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح آپ کی برطانیہ میں قیام کے دور کی کچھ دستاویزات حوادثِ زمانہ سے بچ گئیں۔ ان دستاویزات کے مطابق 34-1933ء کا پراپرٹی ٹیکس آپ نے 66 پونڈ 3 شیلنگ 11 پنس ادا کیا جس کی رسید قومی آرکائیوز کی زینت ہے۔

اب آتے ہیں بطور گورنر جنرل پاکستان قائداعظم کی تنخواہ، مراعات اور ٹیکس پر۔ سب سے پہلے تو اس مفروضے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دینا چاہیے کہ قائداعظم علامتی طور پر ایک روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے۔ قائداعظم جیسے قانون پسند انسان بھلا کیوں کر غیر قانونی روایت ڈالتے جس کی پاکستان کے اکاؤنٹنگ مینول میں گنجائش ہی نہیں۔ واضح رہے کہ برطانوی دور کے اواخر میں وائسرائے کی سالانہ تنخواہ 18,810 برطانوی پونڈ یعنی 2,50,800 روپے (1947ء کی شرح مبادلہ کے لحاظ سے) بنتی تھی جو کہ ماہانہ 20,900 روپے ہوئی۔ پاکستان کے مالی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان میں گورنر جنرل کی ماہانہ تنخواہ اس کے نصف سے بھی کم یعنی 10,416 روپے 10 آنہ مقرر ہوئی۔ تین ہزار ماہانہ سے زائد تنخواہ پر آمدن ٹیکس کا سب سے اونچا سلیب لاگو تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ پانچ ہزار روپے ماہانہ سے اوپر جتنی آمدنی ہو، اس کا 60 فیصد ایک سپر ٹیکس کی مد میں کٹ جاتا تھا۔

چنانچہ بطور گورنر جنرل پاکستان قائداعظم ہر ماہ 2,291 روپے 4 آنہ آمدن ٹیکس اور 3,190 روپے 2 آنہ سپر ٹیکس ادا کرتے۔ اب تنخواہ میں مجموعی 6,112 روپے کی ٹیکس کٹوتی کے بعد آپ کو ماہانہ فقط 4,304 روپے 10 آنہ ملتے۔ وکالت کے دور کی 1,500 روپے یومیہ آمدنی کے لحاظ سے یہ آپ کی تین دن کی بھی آمدن نہ تھی۔ مزید برآں، آپ کی تمام سرمایہ کاری پر منافع ٹیکس منہا کر کے ادا جاتا جبکہ جائیداد کی لین دین پر ٹیکس الگ تھا۔ صرف مہتہ بلڈنگ کراچی خریدنے پر 30,300 روپے ٹیکس ادا ہوا۔

غرض یہ کہ پاکستان بننے کے بعد آپ کی زندگی کے ایک سال 27 دن میں آپ

کو سرکاری خزانہ سے 46,920 روپے 6 آنہ تنخواہ کی مد میں ملے اور اسی دور میں 1,66,620 روپے 12 آنہ آپ نے ٹیکس کی مد میں خزانہ میں جمع کروائے یعنی آمدن سے تقریباً چار گنا۔ کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہمارے قائد نے سرکار سے 12 روپے بھی سال کے وصول کیے ہوں گے؟ یہ ان بدعنوان ٹیکس چور عناصر کی گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں جو چاہتے ہیں کہ حکام کی تنخواہ معمولی رکھی جائے تاکہ حکمران چور بن جائیں۔

آیئے اب قائداعظم کے جائیداد ٹیکس کی ادائیگیوں پر نگاہ دوڑاتے ہیں:

قائداعظم کے سب سے بڑے مکان ساؤتھ کورٹ المعروف جناح منزل بمبئی پر 790 روپے 3 آنہ سالانہ ٹیکس ادا ہوتا تھا جس میں سے گراؤنڈ رینٹ 472 روپے 8 آنہ دوشش ماہی قسطوں میں جبکہ 17 روپے 4 آنہ ماہانہ (جو سال کا 207 روپے بنتا تھا) فری ہولڈ کی مد میں باغات کے ٹیکس کے طور پر حکومت کو ادا ہوتا تھا۔ باقی 111 روپے سالانہ متعدد بلدیاتی محصولات کی مد میں واجب الادا ہوتے۔

جناح منزل دہلی، 470 روپے سالانہ گراؤنڈ ٹیکس، 235 روپے کی دوشش ماہی قسطوں میں ادا کیا جاتا جبکہ 13 ایکڑ باغات کے لیے غیر فلٹر شدہ پانی کا آبیانہ (واٹر ریٹ) سالانہ 255 روپے بھی 127 روپے 8 آنہ کی دوشش ماہی قسطوں میں ادا ہوا کرتا تھا۔

جناح منزل لاہور کی خریداری کے وقت قائداعظم نے مبلغ 441 روپے بطور پراپرٹی ٹیکس ادا کیے تھے جس کا ریکارڈ موجود ہے۔ پھر یہ مکان فوج کی کرایہ داری میں چلا گیا اور طے شدہ سالانہ 8,400 روپے کرایہ (یعنی 700 روپے ماہانہ) میں سے قائداعظم کو ہر سال صرف 3,600 روپے (یعنی 300 روپے ماہانہ) ملا کرتے تھے۔ ہر ماہ جو 400 روپے کی کٹوتی ہوتی، اس میں سے کچھ تو ٹیکس تھا اور باقی مکان کی مرمت وغیرہ کے اخراجات قائداعظم کو واجب الادا کرایہ سے منہا کیے جاتے۔ ٹیکس کی سالانہ تشخیص کیا تھی، اس بارے میں کوئی حتمی دستاویزات موجود نہیں ہیں۔ تاہم اس بنگلے پہ قائداعظم اپنی زندگی میں ہزار ہا روپے بطور ٹیکس ادا کرتے رہے۔

قائداعظم نے موجودہ محمدی ہاؤس کی جگہ واقع جو کمرشل پلاز اخریدا تھا، اس پر

706 روپے 2 آنہ ٹیکس کی ادائیگی کا ریکارڈ موجود ہے۔ اسی طرح مہتہ بلڈنگ (جس میں سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک قائم ہے) کی خریداری پر 30 ہزار 300 روپے ٹیکس کی ادائیگی کا سراغ ملتا ہے۔ اسی طرح ملیر کی زرعی اراضی پہ بھی سالانہ ٹیکس 116 روپے 9 آنہ فی ایکڑ، قائداعظم اور ان کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کی طرف سے پاکستان کے سرکاری خزانے میں جمع کروایا جاتا رہا۔

اس باب کو مکمل کرنے سے پہلے قیامِ پاکستان کے حوالے سے ایک دلچسپ پہلو کا تذکرہ برمحل ہے۔ تحریک پاکستان کی کامیابی میں ایک اہم عنصر قائداعظم کی بطور سیاست دان ٹیکس پالیسی بھی تھی۔ 1946ء کی عبوری حکومت میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں شریک تھے۔ اہم وزارتوں میں سے وزارتِ خارجہ جواہر لال نہرو (یعنی کانگریس) اور وزارتِ خزانہ لیاقت علی خان (یعنی مسلم لیگ) کو ملی۔ یہی دونوں صاحبان 1947ء میں آزادی کے بعد بھارت اور پاکستان کے پہلے پہلے وزیراعظم بنے۔

1946ء میں جب لیاقت علی خان نے بجٹ پیش کیا تو ایک لاکھ روپے سے اوپر کی آمدنی والے افراد پر 25 فیصد آمدن ٹیکس لگا دیا۔ نیز کارپوریٹ ٹیکس اور چائے پر درآمدی ڈیوٹی دگنی کر دی۔ 5,000 روپے سے اوپر منافع پر Capital Gains Tax نافذ کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کمیشن تجویز کیا تاکہ ان عناصر کی نشاندہی کی جا سکے جنہوں نے جنگ عظیم میں منافع خوری سے دولت بنائی یا ٹیکس چوری کیا اور ان پر بھاری جرمانے تجویز کیے۔ اس بجٹ کو عام طور پر ''جناح بجٹ'' کہا جاتا تھا جس سے کانگریس کے حامی سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کے مفادات پر کاری ضرب پڑی اور وہ بلبلا اٹھے۔ کانگریس تو اتنی سیخ پا ہوئی کہ اسے اندازہ ہوا کہ مسلم لیگ کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ یہ قیامِ پاکستان کے عوامل میں انتہائی اہم پہلو ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس ملک کا بانی قوم اتنی فرض شناسی کے ساتھ ٹیکس دہندہ رہا ہو، کیا وجہ ہے کہ وہاں ٹیکس چوری کا رجحان سرطان کی طرح پھیل گیا؟

باب 11

قائد کی جائیداد پر سفارتی تنازعات

محمد علی جناح کی جائیداد پر پاک بھارت سفارتی محاذ آرائی کی ابتدا 1949ء میں قائد کی وفات کے آٹھ ماہ سے بھی کم عرصے میں شروع ہوگئی تھی۔ پاکستان نے 1949ء میں جناح ہاؤس کو ''متروکہ جائیداد'' قرار دیے جانے کے اعلان پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے بھارتی حکومت سے درخواست کی تھی کہ مالا بار پہاڑی پر واقع جناح ہاؤس (سابق ساؤتھ کورٹ) اور لیمنگٹن روڈ پر واقع پیپلز جناح ہال محفوظ بنائے جانے اور سفارتی مقاصد سے استعمال کے لیے پاکستان کے حوالے کیے جائیں۔ پاکستان نے تجاویز پیش کیں کہ ان عمارتوں کو پاکستانی قونصل خانہ، یا ہمارے قونصل جنرل کی رہائش گاہ یا جناح صاحب کی یاد میں عجائب گھر میں تبدیل کر دیا جائے۔ عجائب گھر کی صورت میں اس کا انتظام پاکستان کے پاس ہو۔

بھارتی صحافی اے جی نورانی نے ماہنامہ ''فرنٹ لائن'' میں اپنے طویل مضمون میں کہا ہے ماضی میں بھارت بمبئی کی جناح منزل کو حکومتِ پاکستان کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھا۔ سات مارچ 1955ء کو کابینہ میں اپنی تقریر میں اُس وقت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ جناح ہاؤس کو نیلام کرنے کی بجائے ہم اسے ''حکومتِ پاکستان کو بطور تحفہ پیش کریں گے تاکہ وہ اسے ایک یادگار کے طور پر استعمال کرنا چاہیں تو کر لیں۔'' لیکن جب اُن کی اپنی کابینہ نے پاک دشمنی میں اس تجویز سے اتفاق نہ کیا تو

نہرو بھی اپنے الفاظ سے پھر گئے۔

13 جنوری 1956ء کو پاکستان میں بھارت کے چوتھے ہائی کمشنر مرارجی ڈیسائی نے اس تجویز کی تجدید کرتے ہوئے وزیراعظم جواہر لال نہرو کو لکھا کہ مالا بار پہاڑی پر واقع محمد علی جناح کے بنگلے کو نیلام کی غرض سے قبضے میں لی گئی متروکہ جائیداد کی فہرست سے نکال کر بھارتی حکومت کو از خود اسے جناح کی یادگار کے طور پر محفوظ بنانا چاہیے۔ ہائی کمشنر کا خیال تھا کہ یہ اقدام پاکستان اور بھارت کے درمیان خیر سگالی اور مفاہمت پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ وزیراعظم نہرو نے 19 جنوری کو اپنی وزارت برائے امور خارجہ کو خط بھجوایا تاکہ وہ اس پر اپنی رائے دے۔

اُس وقت بھارت کے سیکرٹری خارجہ سیمل دت نے 20 جنوری کو تحریری سفارشات میں لکھا کہ بھارت کی حکومت کے لیے جناح ہاؤس کی صورت محمد علی جناح کی یادگار خود قائم کرنا مناسب نہ ہوگا کیوں کہ ''مسٹر جناح برِصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے ذمہ دار تھے۔'' لیکن اگر حکومتِ پاکستان اس گھر کو خرید کر جناح کی یاد میں محفوظ بنانا چاہتی ہے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہائی کمشنر کا مشورہ اور سیکرٹری خارجہ کا بیان ایک بار پھر بھارتی کابینہ کے سامنے غور کے لیے رکھے گئے لیکن نہرو کی مرکزی کابینہ نے جناح ہاؤس بمبئی (پرانی ساؤتھ کورٹ) میں جناح صاحب کی یادگار تعمیر کرنے یا پاکستان کو تعمیر کی اجازت دینے سے پھر صاف انکار کر دیا۔ آخر کار یادگار تعمیر کرنے یا جناح منزل کو فروخت کر دینے کے درمیانی راستے کے طور پر اس مسئلے کو التوا میں ڈال دیا گیا۔ اس پر جواہر لال نہرو کی رائے یہ تھی کہ ''میں یہ چاہتا ہوں کہ کم از کم ابھی جناح صاحب کے گھر کو فروخت نہ کیا جائے بلکہ اس سلسلے میں مزید پیش رفت کا انتظار کر لیا جائے۔''

1956ء سے لے کر 1962ء تک بھارت کے پاکستان میں پہلے سفیر یعنی ہائی کمشنر شری پراکاسا ریاست بمبئی اور بعد میں ریاست مہاراشٹرا کے گورنر رہے۔ اُنھوں نے جناح ہاؤس کے خلاف کسی مخاصمت کا مظاہرہ نہ کیا اور جائیداد کی حیثیت جوں کی توں برقرار رکھی۔ جناح منزل متروکہ املاک کے طور پر بھارت کی حکومت کی ملکیت تھی

لیکن اس نے استعمال کے لیے برطانوی قونصل خانے کو پٹے پر دے رکھی تھی۔ بعدازاں چھے سال کے دوران پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والی دو جنگوں، 1965ء اور 1971ء نے تمام منظر نامہ تبدیل کر دیا۔ ایک دوسرے کے لیے موجود خیر سگالی کے جذبات ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ لیکن پھر بھی بھارتی حکومت نے جناح منزل کی حیثیت کو ''متروکہ جائیداد'' کے طور پر برقرار رکھا اور تمام تر ترغیب کے باوجود دہلی سرکار اسے ''دشمن کی جائیداد'' قرار دینے کی ہمت نہ کر سکی۔ دشمن کی جائیداد قرار دینے کی صورت میں جناح منزل کو ضبط کر کے پاکستان سے بے دخل ہونے والے ہندو مہاجرین کے فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر یہ خیر سگالی جائیداد کے سابق مالکان بیگم و محمد علی جناح کی یاد میں تھی۔ تاہم جنگوں کے بعد طرفین کے جنگجو سوچ رکھنے والے عناصر نے ایک دوسرے کے لیے کسی قسم کے مثبت طرزِ عمل کو اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور بنا دیا۔ تلخی اور تناؤ کے حالات میں جناح منزل بمبئی کو پاکستان حوالے کرنے کی دیرینہ تجویز پر عمل درآمد خارج از امکان دکھائی دینے لگا۔

1977ء کے بعد قائم ہونے والی جنرل ضیاالحق کی فوجی حکومت کے دوران پاکستان نے ایک مرتبہ پھر بھارت سے پیہم درخواست کرنا شروع کی کہ یا تو جناح منزل بمبئی کو پاکستان کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے یا کم از کم کرائے پر دے دیا جائے۔ پاکستان نے اسے اپنے بانی کی یاد میں اپنا قونصل خانہ بنانے کی خواہش از سرِ نو ظاہر کی۔ واضح رہے کہ 1980ء کی دہائی کے اوائل میں برطانوی ہائی کمشنر نے جناح ہاؤس خالی کر دیا تھا۔ پاکستان کے ساتھ اعتماد سازی کی فضا قائم کرنے کے لیے بھارت کے اُس وقت کے وزیرِ خارجہ نرسہاراؤ نے ایک مفاہمت آمیز تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ بھارت جناح منزل پاکستان کو فروخت نہیں کرے گا لیکن اسے حکومتِ پاکستان کو کرائے پر دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے یادگار یا عجائب گھر میں تبدیل کرنے کی بجائے بمبئی میں موجود اپنا قونصل خانہ یہاں منتقل کر لے۔ تاہم اس تجویز پر بھی عمل درآمد کی نوبت نہ آئی۔ آنے والے برسوں میں نرسہاراؤ بھارت کے وزیرِاعظم بن گئے۔ اگرچہ وہ اپنی ہی تجویز کی

طرف ابھی بھی جھکاؤ رکھتے تھے لیکن سیاسی طوفان کے خوف سے وزیرِاعظم کے عہدے سے بھی اس کی عملی تعبیر کے لیے کچھ نہ کر سکے۔

1990ء کی دہائی کے اوائل میں بابری مسجد کی شہادت، مقبوضہ کشمیر میں قتلِ عام اور بالخصوص کراچی میں ایک لسانی تنظیم کی طرف سے قتل و غارت میں بھارت کی مبینہ پشت پناہی کے پیشِ نظر پاکستان نے 1994ء میں کراچی میں بونس روڈ (موجودہ فاطمہ جناح روڈ) پر واقع بھارتی قونصل خانہ بند کر دیا۔ یہ جناح منزل کراچی کے بالمقابل واقع تھا اور کراچی کے پاکستان کا دارالحکومت ہونے کے دور میں یہی بھارتی سفارت خانہ کام کرتا تھا۔ بھارت نے جوابی کارروائی کے طور پر بمبئی کا پاکستانی قونصل خانہ بند کر دیا۔

تین سال بعد بھارت نے پاکستان سے کراچی میں اپنا قونصل خانہ دوبارہ کھولنے کی درخواست کی۔ اس پر پاکستان نے بمبئی کا جناح ہاؤس حاصل کرنے کی شرط رکھی۔ چنانچہ کراچی میں بھارتی قونصل خانہ اور ممبئی کی جناح منزل میں پاکستانی قونصل خانہ کھولنا جناح ہاؤس پر تنازع کی وجہ سے ناممکنات میں سے ہو گیا۔ یہ دونوں جائیدادیں گزشتہ تین عشروں سے کراچی اور بمبئی میں خالی پڑی ہیں۔ صدر پرویز مشرف نے آگرہ امن کانفرنس 2001 کے موقع پر اپنے مشہور دورۂ بھارت کے موقع پر وزیرِاعظم اٹل بہاری واجپائی سے جناح منزل پاکستان کے حوالے کرنے کی درخواست کی تاکہ پاکستان وہاں اپنا قونصل خانہ کھول لے۔ بھارت نے تجویز پر غور کرنے پر اتفاق کر لیا۔ تاہم 2003ء میں دہلی سرکار نے جناح ہاؤس کو وزارتِ خارجہ کے ماتحت انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کو دینے کا فیصلہ کیا اور اسے جناح ہاؤس کو سارک عجائب گھر میں تبدیل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ یہ اقدام دونوں ممالک کے وزرائے خارجہ کے درمیان اس مسئلے پر ہونے والی گفتگو میں رکاوٹ کا باعث تو نہ بنا لیکن جون 2004ء میں ہونے والی بات چیت جناح منزل بمبئی پر کسی مفاہمت پر پہنچنے میں ناکام رہی۔

مئی 2005ء میں پاکستانی ہائی کمیشن کے افسران کو قونصل خانہ قائم کرنے کے

لیے ممبئی اور اس کے مضافات میں بہت سی عمارتیں دکھائی گئیں لیکن ان میں مالا بار ہل پر قائم جناح ہاؤس شامل نہیں تھا۔ پاکستان نے کسی جائیداد میں دلچسپی ظاہر نہ کی تاوقتیکہ بمبئی کا جناح ہاؤس اور جناح ہال اس کے حوالے کر دیے جائیں۔

2007ء میں بھارت کے سرکاری ذرائع نے اشارہ کیا جناح ہاؤس کی بابت مزید پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کی وجہ محمد علی جناح کی بیٹی دینا اور اُن کے نواسے نصلی واڈیا کی طرف سے جناح ہاؤس پر کیا گیا دعویٰ ہے۔ بھارتی حکومت نے اپنا موقف دیا کہ جناح کے ورثا کی طرف سے عدالت میں دائر کیے گئے حقِ ملکیت کے دعوے کی وجہ سے وہ جناح ہاؤس کو حکومتِ پاکستان کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ تاہم اس نے یقین دہانی کرائی کہ واڈیا خاندان کے دعوے پر ''ہمدردی سے غور'' کیا جائے گا۔ اور یہ کہ جب تک عدالتی مقدمات طے ہوں، جناح ہاؤس ایک ثقافتی مرکز ہی رہے گا۔ تاہم مدعیان نے عدالت سے حکم نامہ حاصل کرلیا کہ فیصلہ ہونے تک جائیداد کو سیل یعنی ثقافتی سرگرمیوں کو موقوف کر دیا جائے۔

2014ء میں قائم ہونے والی وزیراعظم مودی کی بی جے پی حکومت کے دوران حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ اب پارٹی کے جنگجو عناصر جناح ہاؤس کو تباہ یا منہدم کرنے کے درپے ہیں۔

باب 12

قائد کی جائیداد پر خاندانی مقدمات

قائداعظم کی 1948ء میں رحلت کے بعد ابتدائی برسوں کے دوران جناح ہاؤس بمبئی محترمہ فاطمہ جناح اور بھارتی حکومت کے درمیان باعثِ نزاع رہا۔ اس کے بعد دوقوموں پاک و ہند کے درمیان بھی جھگڑے کا باعث بن گیا۔ اور پھر 1994ء سے اس تنازع میں جناح خاندان ہی سے ایک اور فریق شامل ہوگیا جب قائداعظم کی عمر رسیدہ بیٹی دینا جناح نے اس جائیداد پر اپنا دعویٰ جتانا شروع کر دیا۔ 2008ء میں متروکہ جائیداد ایکٹ کے خاتمے کے بعد محمد علی جناح کی ہمشیرہ مریم عابدین بائی پیر بھائی کی اولاد بھی دعویدار ہوگئی، یعنی کہ جناح خاندان کی دو شاخوں کے درمیان قانونی تنازع کی شکل اختیار کر گیا۔

قائداعظم اپنی وصیت میں بمبئی کا جناح ہاؤس، اس سے ملحق رقبہ، فرنیچر، ظروف، چاندی اور بیرونی حویلی اپنی بہن فاطمہ جناح کے نام لکھ گئے تھے۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ یہ وصیت 1947ء میں ملنے والی آزادی اور ہونے والی تقسیم سے بہت پہلی تیار کی گئی تھی، بلکہ وصیت نویسی کے وقت 1940ء کی قراردادِ پاکستان بھی منظور نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں واقع ہونے والی بہت سی تبدیلیوں کی 1930ء کی دہائی میں پیش بینی نہیں کی جاسکتی تھی۔ جناح منزل ممبئی پر اٹھنے والے قانونی تنازعات کا تعلق جزوی طور پر قائداعظم کی وصیت سے بھی ہے۔

یہ ذکر برمحل ہوگا کہ اگر محمد علی جناح اسماعیلی مسلمان برادری کے مروجہ قانون کے مطابق اپنی وصیت نہ چھوڑ گئے ہوتے تو اثنا عشری وراثت کے قوانین کے تحت جائیداد اُن کی چاروں بہنوں کو مل جاتی کیوں کہ اکلوتے بھائی احمد علی جناح، قائداعظم کی وفات سے ایک سال پہلے ستمبر 1947ء میں انتقال کر گئے تھے۔ چوں کہ فاطمہ جناح پاکستان جا چکی تھیں، اس لیے بھارتی قانون کے تحت وہ بھارت میں جائیداد کی حق دار نہیں تھیں۔ باقی تینوں بہنیں (بیگم رحمت بائی قاسم بھائی، بیگم مریم بائی پیر بھائی اور بیگم شیریں بائی جعفر بھائی) جناح ہاؤس کی ورثا قرار پاتیں۔ وہ یا ان کے لواحقین یقیناً جائیداد کو فروخت کر کے رقم محمد علی جناح کے بھارت میں رہ جانے والی مسلمان ورثا میں تقسیم کر لیتے۔ یہ چیز جناح صاحب کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی محبت کی نشانی ساؤتھ کورٹ فروخت یا تقسیم ہو۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مکان اپنی غیر شادی شدہ بہن فاطمہ جناح کے نام لکھ دیا۔ بعد میں متروکہ جائیداد کے قوانین کے تحت وہ جائیداد بھارتی حکومت کے پاس چلی گئی کیوں کہ اس کی واحد مالک فاطمہ جناح پاکستانی شہری بن چکی تھیں۔ دوسری طرف وصیت کے ہوتے ہوئے بھارت میں رہ جانے والی قائد کی ہمشیرگان اس بنگلے کی مالک نہیں رہی تھیں۔

قائدِاعظم کی حیات میں اُن کے ورثا میں سے کسی کو اجتماعی یا انفرادی طور پر وصیت کے مندرجات کا اندازہ نہیں تھا۔ جناح صاحب کی رحلت پر وزیراعظم لیاقت علی خان کے لیے بھی حیرت کا سامان تھا کہ قائد نے اُنہیں بھی اپنی وصیت پر عمل درآمد کرانے کے لیے عامل (Executant) یعنی نافذ کنندہ نامزد کیا تھا۔ جب فاطمہ جناح کو علم ہوا کہ اب وہ جناح منزل بمبئی کی مالکن ہیں تو اُنھوں نے وراثت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے 11 اکتوبر 1948ء کو ایک متفرق درخواست نمبر 54 چیف کورٹ کراچی (موجودہ سندھ ہائی کورٹ) میں دائر کی۔ عدالت نے جناح صاحب کی وصیت کی بنیاد پر 25 اکتوبر 1948ء کو وراثت سرٹیفکیٹ محترمہ فاطمہ جناح کے حق میں جاری کر دیا۔

محترمہ فاطمہ جناح نے بمبئی کے وزیراعلیٰ بی جی کھیر کے نام ایک ٹیلی گرام اور

عدالت سے حاصل کردہ سرٹیفکیٹ بھیج کر جناح صاحب کی وصیت سے مطلع کیا کہ بمبئی کی جناح منزل اب اُن کی ملکیت ہے۔ اس سرٹیفکیٹ نے الٹا اثر کیا۔ اسے بنیاد بنا کر بھارت نے فاطمہ جناح کو جناح ہاؤس دینے سے انکار کر دیا۔ دریں اثنا بمبئی کی ریاستی حکومت نے 17 مئی 1949ء کو متروکہ جائیداد ایکٹ نافذ کیا۔ یہ قانون بھارت چھوڑ کر پاکستان کی شہریت اختیار کرنے والے کسی بھی شہری کی جائیداد حکومت کی نگرانی میں دے دیتا تھا۔ ایسا ہی قانون پاکستان میں بھی بنایا گیا جس کے تحت بھارت چلے جانے اور وہاں کی شہریت حاصل کرنے والے شہریوں کی جائیداد حکومتِ پاکستان کی تحویل میں آ گئی تھی۔ فاطمہ جناح کے ٹیلی گرام اور عدالتی حکم نامے نے قانونی طور پر ثابت کر دیا کہ فاطمہ جناح پاکستان کی شہری ہیں اور یہ کہ جناح ہاؤس اُن کی ملکیت ہے۔ اگر جناح صاحب کی وصیت منظرِ عام پر نہ آتی تو بھارتی حکومت کے پاس اس مکان کو متروکہ جائیداد قرار دے کر حاصل کرنے کا کوئی جواز نہ ہوتا کیوں کہ جناح صاحب کے باقی تمام قانونی ورثا بشمول اُن کی چار میں سے تین بہنیں بھارتی شہری تھیں اور وہ وہیں کے مسلم عائلی قانون کے تحت شادی شدہ اور آباد تھیں۔

فاطمہ جناح کے ٹیلی گرام کی بنیاد پر بمبئی کی حکومت نے ستائیس جون 1949ء کو جناح ہاؤس کو متروکہ جائیداد قرار دے کر اس کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اگلے سال سترہ اپریل 1950ء کو بھارت کی مرکزی حکومت نے اپنا متروکہ جائیداد کا قانون نافذ کر دیا جو بمبئی ریاست کے قانون پر فوقیت رکھتا تھا۔ جب جناح صاحب اس دنیا میں نہیں رہے تھے تو بھی وزیراعظم نہرو کے کسی فعل سے جناح خاندان کے خلاف انتقام کا شائبہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن نہرو بھی سیاسی دباؤ سے آزاد نہیں تھے۔ چوں کہ جناح ہاؤس ایک ایسی جائیداد بن گیا جو متروکہ تھی اور جس کا کنٹرول مرکزی حکومت کے پاس تھا۔ اس سے بھارت کے وزیراعظم کو اسے برطانوی قونصل خانے کو دینے کا اختیار مل گیا کیوں کہ جناح صاحب کی بھی یہی خواہش تھی کہ اس میں کوئی سفارتی مشن قائم ہو تاکہ بنگلے کی دیکھ بھال اچھی طرح سے ہوتی رہے۔ یہ مکان کم و بیش تین عشروں تک برطانیہ کے سفارتی استعمال میں رہا۔

اس دوران بھارتی پالیمنٹ نے 9 اکتوبر 1954ء کو ایک اور قانون ''ڈسپلیسڈ پرسنز یعنی بے دخل افراد (نقصان کی تلافی اور بحالی) ایکٹ'' منظور ہوا جس کے تحت بھارتی حکومت کسی بھی متروکہ املاک کو پاکستان سے ہجرت کر کے بھارت آنے والے بے گھر افراد کی بحالی اور امداد کے لیے استعمال کر سکتی تھی۔ ایسی متروکہ املاک کو استعمال یا فروخت کر کے مہاجرین کو زرِ تلافی بھی ادا کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ 18 جون 1955ء کو متروکہ جائیداد ایکٹ 1950ء کے تحت ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے بھارت کی مرکزی حکومت نے جناح ہاؤس کا قبضہ دوبارہ حاصل کر لیا۔ تاہم نئے قانون کے تحت وسیع اختیارات کے باوجود پاکستان کی طرف سے پیہم دباؤ کی وجہ سے بھارت کی مختلف حکومتوں نے جناح ہاؤس کی حیثیت تبدیل نہ کی۔

محترمہ فاطمہ جناح عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اپنے دعویٰ ملکیت کے لیے اصرار کرتی رہیں۔ اُنھوں نے مہاراشٹرا ہائی کورٹ میں آخری درخواست 1962ء میں دائر کی تھی۔ مقدمہ حتمی طور پر ہار جانے پر اُنھوں نے حکومتِ پاکستان سے اس کے متبادل ایسی ہی ایک متروکہ جائیداد کراچی میں حاصل کر لی جس کو موہاٹا محل کہا جاتا ہے۔ پاکستان بھی بھارت سے پاکستان آنے والے افراد کو متروکہ جائیداد الاٹ کرنے کا ویسا ہی قانون رکھتا تھا۔ متروکہ جائیداد موہاٹا محل کو جناح ہاؤس بمبئی کے متبادل کے طور پر شناخت کیا گیا۔ اس کا مالک ایک ہندو کاروباری شخص شیورتن سی موہاٹا دہلی جا کر آباد ہو چکا تھا۔ 1964ء میں کراچی میں متروکہ املاک قبول کرتے ہوئے فاطمہ جناح تکنیکی طور پر جناح منزل بمبئی کے دعوے سے دستبردار ہو گئیں۔

فاطمہ جناح کی دستبرداری کے تیس سال بعد 75 سالہ دینا جناح کو اچانک کیا ہوا کہ دعویٰ کر ڈالا کہ جناح ہاؤس تو اُن کے والد کی وفات کے بعد سے ان ہی کا تھا۔ اُنھوں نے مہاراشٹرا ہائی کورٹ میں آئینی درخواست نمبر 1228/94 دائر کر دی جس میں اُنھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اُن کے والد صاحب یعنی قائدِ اعظم اپنی تمام جائیداد پر کوئی ہدایت نامہ چھوڑے بغیر ہی فوت ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ اُنھوں نے فاطمہ جناح یا کسی اور

کے حق میں کوئی وصیت نہیں چھوڑی تھی، چنانچہ وہ یعنی دینا جناح ساؤتھ کورٹ المعروف جناح منزل کی بلاشرکتِ غیرے مالکن ہیں۔

بمبئی میں راقم الحروف سے ایک انٹرویو میں جناح صاحب کی بہن مریم بائی پیر بھائی کے ورثا کے وکیل یوسف موچھلا کا کہنا تھا کہ اس دعوے سے جناح صاحب کی بہنوں کے ورثا میں بہت غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ دینا جانتی تھیں کہ قائد کی وصیت موجود ہے لیکن وہ دیدہ دلیری سے انجان بن رہی تھیں۔ تاہم بھارتی حکومت نے دینا کے دعوے کو پوری شدومد سے چیلنج کیا اور مختلف اعلیٰ عدالتوں، بشمول پاکستان کی سندھ ہائی کورٹ کے فیصلے کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ جناح صاحب کی وصیت مصدقہ طور پر موجود تھی اور اس پر عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس وصیت سے مستفید ہونے والے افراد میں فاطمہ جناح شامل تھیں جن کے نام جناح منزل کی گئی تھی لیکن بھارتی حکومت کے اسے متروکہ جائیداد قرار دے کر ضبط کر لینے کے فیصلے سے فاطمہ جناح اس سے محروم ہو گئیں۔

اسی وصیت سے دوسری سب سے زیادہ مستفید ہونے والی شخصیت مدعیہ دینا جناح خود تھیں۔ وہ کئی عشروں سے وصیت کے تحت ملنے والے مالی فوائد حاصل کر رہی تھیں۔ اگر اُنہیں یقین ہوتا کہ اُن کے والد کی کوئی وصیت ہے ہی نہیں تو وہ وصیت کے مندرجات پر تیز تر عمل درآمد اور رقم کی فوری منتقلی میں معاونت کے لیے اپنی پھپھو فاطمہ جناح کو خطوط نہ لکھتیں۔ جب دینا جناح نے اس حقیقت کا سامنا کیا کہ وہ حبیب بینک لندن کے اکاؤنٹس سے قائد کی وصیت کردہ رقم وصول کرتی رہی تھیں تو اُنھوں نے خود کو ایک قانونی بند گلی میں پایا۔ 1995ء میں مہاراشٹرا ہائی کورٹ نے دینا کو مزید سبکی سے بچنے کے لیے آئینی درخواست واپس لینے کی اجازت دے دی اور اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔

ایک عشرہ بعد 2005ء میں جناح منزل کے حوالے سے آئینی درخواستوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ وجہ یہ بنی کہ اُس سال بھارتی پارلیمنٹ (لوک سبھا) نے بے گھر ہونے والے افراد کا 1954ء کا ایکٹ منسوخ کر دیا۔ اسے منسوخ کرنے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ 1947ء کے بعد سے زیادہ تر ہندو مہاجرین گزشتہ پانچ عشروں کے دوران

بھارت میں آباد ہو چکے ہیں لیکن قانون کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بعض بدعنوان افراد ریاست کی زمین اور دیگر متروکہ املاک پر من گھڑت دعوے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ایسا ہی ایک چالاک مدعی نصلی واڈیا تھا جس نے اپنی 90 سالہ والدہ کو 26 ارب روپے مالیت کے جناح ہاؤس کی ملکیت کا دعویٰ دائر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اُس وقت وہ اپنی والدہ دینا جناح کو چھوڑ چکا تھا جو نیویارک میں تنہائی کی زندگی بسر کر رہی تھیں لیکن اگست 2007ء میں نصلی کے مبینہ دباؤ میں دینا واڈیا جناح کی طرف سے آئینی درخواست نمبر 1578/07 دائر کی گئی۔ اس میں کہا گیا کہ 1954ء کے ایکٹ کی منسوخی کا مطلب ہے کہ جناح ہاؤس کی سابق قانونی حیثیت بحال ہو گئی ہے یعنی وہ حیثیت جو 1949ء میں اسے متروکہ جائیداد قرار دینے سے پہلے تھی۔ دینا نے دعویٰ کیا اب وہ جناح صاحب کی واحد زندہ وارث کے طور پر جناح ہاؤس کی حقدار ہیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن کے والد صاحب کا تعلق خوجہ اسماعیلی مسلمان برداری سے تھا اس لیے وہ نہ سنی تھے اور نہ ہی اثنا عشری شیعہ۔ دینا جناح کے وکلا نے موقف اختیار کیا کہ خوجہ اسماعیلی شیعہ تجارت پیشہ ذات لوہانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہندو وراثت کے قوانین کی پیروی کرتے ہیں جن کے مطابق وراثت پر بیٹی کا حق ہوتا ہے۔ اُن کے وکیل فالی نریمن نے بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلوں کی کئی ایک مثالیں دیتے ہوئے کوشش کی کہ جناح منزل پر دینا جناح کا حق ثابت کیا جا سکے۔

دینا نے مزید دعویٰ کیا کہ اُن کے والد صاحب پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے تھے جبکہ اُس نے یعنی دینا نے 1938ء میں ایک ہندوستانی شہری سے شادی کی اور وہ 1947ء کی تقسیم کے بعد بھارت میں ہی رہیں۔ دینا نے کہا کہ 1954ء کے ایکٹ کی منسوخی سے جناح منزل اب کوئی متروکہ جائیداد نہیں رہی لہٰذا وہ بطور ایک بھارتی شہری اس کی ملکیت کی حق دار ہے۔

اس دعوے پر بھی بھارتی حکومت نے سخت مزاحمت کی۔ ممبئی کے کسٹوڈین آفس کے انچارج دنیش سنگھ نے عدالت کو بتایا کہ ''محمد علی جناح کی وصیت پر 30 مئی 1939ء کی

تاریخ ہے اور متروکہ جائیداد کے نگران کے ریکارڈ سے اس وقت کی بمبئی ہائی کورٹ (جو آج کل مہاراشٹر ہائی کورٹ کہلاتی ہے) کا جاری کردہ تصدیقی سرٹیفکیٹ بھی مل گیا ہے۔ ''مہاراشٹر ہائی کورٹ کے سامنے بیانِ حلفی جمع کراتے ہوئے وزارتِ امورِ خارجہ نے بھی دینا جناح کے دعوے کو مسترد کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ دینا جناح کی بجائے محمد علی جناح کی غیر شادی شدہ بہن مرحومہ فاطمہ جناح اس جائیداد کی قانونی وارث تھی۔ حلف نامے میں کہا گیا، ''یہ بھارتی حکومت کا شروع سے ہی یہی موقف رہا ہے کہ محمد علی جناح کی وصیت کے مطابق فاطمہ جناح ہی اس گھر کی قانونی وارث تھیں۔ فاطمہ جناح نے وصیت پر عمل درآمد کرانے کے لیے ہائی کورٹ سے وارثت کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ 1939ء کی وصیت نہ صرف موجود تھی بلکہ محمد علی جناح نے یہ جائیداد فاطمہ جناح کے نام کر دی تھی۔'' ایم ای اے کے حلف نامے کے مطابق، ''فاطمہ جناح نے تقسیم ہند کے وقت پاکستان کی طرف ہجرت کر لی تھی، اس لیے ان کی ملکیت والی جائیداد حکومتِ ہند نے متروکہ املاک کے طور پر قبضے میں لے لی۔''

2007ء ہی میں اس دعوے کے ساتھ ساتھ دینا جناح نے بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ کو براہِ راست ایک خط لکھ کر جناح منزل بمبئی کی فوری حوالگی کا مطالبہ کیا۔ مختلف بھارتی تنظیموں نے دینا جناح کے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی۔ آر ایس ایس رہنما بال ٹھاکرے نے بیان جاری کیا کہ آج جناح منزل ان کی صاحبزادی یا خاندان کے کسی فرد کو دے دی گئی تو کل مسلمان قطب مینار اور تاج محل کا بھی مطالبہ شروع کر دیں گے۔

جنوری 2008ء میں قائد کی ہمشیرہ مریم بائی پیر بھائی کے داماد اور نواسے بھی جناح ہاؤس کی ملکیت کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ رجب علی ابراہیم اور شاکر ابراہیم نے مہاراشٹر ہائی کورٹ میں آئینی درخواست نمبر 1624/08 دائر کرتے ہوئے دینا جناح کے قائد کی کوئی وصیت نہ ہونے کے دعوے کو جھٹلایا۔ متروکہ جائیداد کے نگران کے حلف نامے اور بھارتی وزارتِ خارجہ کا حوالہ دیتے ہوئے اُنھوں نے دلیل دی کہ فاطمہ جناح کے حق میں وصیت ایک ثابت شدہ حقیقت تھی۔ اس لیے متروکہ جائیداد ایکٹ کے 2005ء میں

منسوخ ہونے سے جناح ہاؤس پر فاطمہ جناح، اور اُن کی غیر موجودگی میں اُن کے تمام وارثان پر حق وراثت ثابت ہو جاتا ہے۔ اب چوں کہ فاطمہ جناح کی تو کوئی اولاد تھی ہی نہیں جبکہ ایک بہن شیریں جناح بھی بے اولاد انتقال کر گئی تھیں، اس لیے جناح منزل کو دینا جناح (محمد علی جناح کی بیٹی)، فاطمہ جناح جونیئر (قائد کے بھائی احمد علی جناح کی بیٹی جو اب فاطمہ جیوفرٹ ہے) اور باقی دونوں بہنوں رحمت بائی جناح اور مریم بائی جناح کے ورثا میں تقسیم ہونا چاہیے۔

یہ مقدمہ مزید ایک عشرہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ دو نومبر 2017ء کو دینا جناح فوت ہو گئیں۔ اُن کی وفات کے بعد نصلی واڈیا، چیئرمین واڈیا گروپ، نے اپنی والدہ مرحومہ کی دائر کردہ درخواست میں فریق بنتے ہوئے جناح ہاؤس کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ نصلی کا موقف تھا کہ بمبئی متروکہ جائیداد ایکٹ 1949ء کے تحت متروکہ جائیداد کو ثقافتی ورثہ قرار دینے کا مرکزی حکومت کا نوٹی فیکیشن بلا جواز تھا۔ نصلی کے وکلا نے یہ بحث بھی کی کہ محمد علی جناح کی وصیت کی ہائی کورٹ نے کبھی تصدیق نہیں کی تھی اس لیے یہ غیر موثر ہے۔ نصلی واڈیا نے زور دیا کہ شیعہ مسلم قانون کے تحت جناح ہاؤس کی حقدار دینا جناح ہی تھیں۔ چوں کہ وہ حیات نہیں ہیں اس لیے وہ (نصلی) جناح منزل کا وارث ہے۔

دینا واڈیا جناح اور اُن کی اولاد کے دعوے جانچ کی چھلنی سے نہ گزر پائے۔ سب سے پہلے تو دینا بھارتی شہری نہیں تھیں اور نہ ہی وہ بھارت میں رہتی تھیں۔ اُنھوں نے برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی مگر کئی عشروں سے امریکہ کے شہر نیویارک میں رہائش پذیر تھیں۔ دوسری بات یہ کہ اُنھوں نے ایک بھارتی شخص سے شادی ضرور کی تھی لیکن اُن کی شادی تقسیم ہند سے بہت پہلے طلاق پر ختم ہو گئی۔ چنانچہ اس سوال کی کوئی منطق نہیں کہ ان کی پھپھو (فاطمہ جناح) نے ایک غیر ملک (پاکستان) کی شہریت حاصل کر لی تھی جبکہ دینا اور اُس کے شوہر نے ایسا نہیں کیا تھا، کیوں کہ اُن کی شادی 1943ء میں ختم ہو گئی تھی۔ تیسرا یہ کہ اگر دینا کے والد گرامی ایک مسلمان تھے، چاہے وہ خوجہ شیعہ تھے یا اثنا عشری یا سنی تو وہ کسی صورت قائد کی وارث نہیں ہو سکتی تھیں کیوں کہ اُنھوں نے ایک مسیحی سے شادی کر لی

تھی۔ اسلامی فقہ کی تمام تینوں بڑی شاخوں کے نزدیک کم از کم شادی شدہ زندگی کے دوران وہ ایک مسلمان کی وصیت کی حق دار نہیں رہی تھیں۔ لیکن طلاق کے بعد وہ اپنے والد کی اُسی وصیت سے فائدہ حاصل کر رہی تھیں جس کی حقانیت سے آج اُنہیں انکار تھا۔ 1994ء میں وہ خود اس وصیت کو متنازع بنا کر ہائی کورٹ میں دعویٰ کر چکی تھیں لیکن پھر اُنہیں وہ دعویٰ واپس لینا پڑا تھا۔ تاہم 2007ء میں اس 90 سالہ خاتون کو ایک بار پھر جھوٹا دعویٰ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے پیچھے اُن کے لالچی بیٹے کی امید ہو سکتی ہے کہ دینا جناح کی وفات کے بعد یہ بھاری جائیداد اُس کی جھولی میں جا گرے گی۔

باب 13

قائد کا ترکہ اور وراثت کے اہم سوالات

مسلم عائلی قوانین اور قواعدِ وراثت سنی، اثنا عشری شیعہ اور اسماعیلی مسالک میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تینوں مسالک میں مذہب سے پھر جانے والا شخص حقِ وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ بیگم مریم جناح اپنے شوہر قائدِ اعظم سے پہلے فوت ہو گئی تھیں جبکہ اُن کی بیٹی دینا جناح ایک غیر مسلم شخص سے شادی کرتے ہوئے مسلم قوانین کی رو سے خود بخود وراثت سے محروم ہو گئیں۔ تاہم شادی کے کچھ سال بعد طلاق کی وجہ سے وہ دوبارہ وراثت کی حقدار ٹھہری تھیں۔ تاہم قائدِ اعظم کے پانچ بھائی بہنوں (ایک بھائی اور چار بہنیں) کے حصے تینوں مسالک کی فقہ میں مختلف تھے۔ مثال کے طور پر فاطمہ جناح کی وفات کے بعد اُن کی بڑی بہن شریں جناح شیعہ قانون کے تحت اس تمام جائیداد کی حقدار ہوتیں۔ سنی مکتبہ فکر کے تحت اُن کا حصہ مرحومہ بہن کے ترکہ میں نصف بنتا تھا جبکہ اسماعیلی قانون کے مطابق اُن کا فاطمہ جناح کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں تھا۔

یہ بحث کہ محمد علی جناح کی وفات کے کئی عشرے بعد یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ اُن کا تعلق کس مسلک سے تھا یا اُن کی اہلیہ یا بہنوں کے مسالک کیا تھے؟ اس تنازع کی بنیادیں نظریاتی سے زیادہ معاشی تھیں۔ زندگی بھر جناح صاحب کی اسلام سے وابستگی کسی مسلکی شناخت سے بالاتر تھی۔ تاہم زندگی کے معاملات میں جہاں مذہبی سرگرمی درکار ہو وہاں وہ باری باری شیعہ، سنی اور اسماعیلی کے تینوں مسالک میں سے کسی کا انداز اختیار کر لیتے

تھے۔ چوں کہ اُنھوں نے کسی ایک مسلک کی طرف ترجیحی وابستگی اختیار نہیں کی تھی اس لیے اُن کا ہر ممکنہ وارث اپنے مفاد کو دیکھتے ہوئے کسی مخصوص مسلک کی فقہ کے مطابق دعویٰ کرتا دکھائی دیا۔

ریکارڈ کے مطابق قائدِ اعظم عید کے بڑے بڑے اجتماعات میں شرکت کرتے تھے۔ ایسی کوئی مثال نہیں کہ اُنھوں نے کسی مخصوص مسلک کے عید کے اجتماع کو ترجیح دی ہو۔ بعض مرتبہ جناح صاحب ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مختلف مسالک کی رسومات میں برابر شرکت کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر بیگم جناح کا قبولِ اسلام سنی مسلک کے مطابق ہوا جبکہ اگلے روز اُن کا نکاح شیعہ روایت کے مطابق ہوا تھا۔ جناح صاحب کی سرکاری نمازِ جنازہ سنی مسلک کے مطابق ادا کی گئی لیکن اُن کی وصیت اسماعیلی روایت کے مطابق تھی۔ جناح صاحب زندگی بھر بمبئی کی اثنا عشری جماعت کو چندہ ادا کرتے رہے لیکن کبھی مجلسِ عاشور میں دکھائی نہ دیے۔ دوسری طرف وہ عید میلاد کی تقریب میں ضرور دکھائی دیے جو کہ بنیادی طور پر سنی مسلک کی سرگرمی سمجھی جاتی ہے۔ اُنھوں نے مسلکی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر اپنی ہمشیرگان کی شادیاں کروائیں۔ اُن کا ایک بہنوئی سنی تھا تو دوسرا شیعہ مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والا۔

جناح صاحب نے اپنی حتمی وصیت لٹل گبز روڈ بمبئی کے بنگلے میں 30 مئی 1939ء کو لکھی تھی۔ اس دوران ساؤتھ کورٹ کی تعمیرِ نو جاری تھی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا، قائدِ اعظم نے اپنی وصیت اسماعیلی مروجہ قانون کے تحت لکھی تھی۔ یہ قانون اُنہیں اپنی مرضی سے حصے متعین کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ وصیت کے دو حصے تھے۔ پہلا چھوٹا حصہ خاندان کے افراد کے متعلق ہے جبکہ دوسرا بڑا حصہ پاکستان اور بھارت کے کئی ایک تعلیمی اداروں کے نام وراثت چھوڑتا ہے۔

وصیت کے مندرجات خاص طور پر تعلیمی اداروں کے نام چھوڑی گئی وراثت کی تفصیل بہت سے مقامات پر مل جاتی ہے لیکن اس پر شاید تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے کہ قائد کی وصیت پر عمل درآمد کس حد تک ہوا یا ہو سکتا تھا۔ جناح صاحب نے اپنے قابلِ اعتماد

دست راست لیاقت علی خان (متوفی 1951ء) اور اپنی بہن فاطمہ جناح (متوفی 1967ء) کو اپنی وصیت پر عمل درآمد کرانے کے لیے عامل اور مختار کے طور پر نامزد کیا تھا۔ ویسے تو اُن کے قانونی معاون محمد علی چائے والا تیسرے نامزد موصی اور عامل تھے لیکن ان کی طرف سے بھارتی شہریت برقرار رکھنے پر ان کا نام تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ مرزا ابوالحسن اصفہانی کو دے دی گئی۔ اُن کی جائیداد اکٹھا کرنے اور نمٹانے میں حائل پیچیدگیاں لیاقت علی خان اور فاطمہ جناح کی زندگیوں میں بھی دور نہیں ہو سکی تھیں۔ سب سے پیچیدہ مسئلہ یہ تھا کہ اُن کی وراثت کے حق داروں میں سے چار (تین بہنیں اور ایک بیٹی) بھارت میں تھے جبکہ چھے میں سے چار وارث تعلیمی ادارے بھی بھارت کی جغرافیائی حدود میں تھے۔ اس سے بھی معاملات مزید الجھ گئے۔ وصیت کی تعمیل کے لیے سندھ ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے تحت جناح ٹرسٹ قائم کیا گیا۔ ٹرسٹ کا دعویٰ ہے کہ قائد کی وصیت پر 1994ء تک مکمل عمل درآمد ہو گیا۔ اگر ایسا ہے تو بھی وصیت کی تعمیل میں نصف صدی کا طویل اور صبر آزما عرصہ لگا۔

قائدِاعظم وصیت تحریر کرنے کے نو سال بعد تک حیات رہے اور اُنھوں نے اس عرصہ کے دوران اپنی وصیت تبدیل نہ کی اور نہ ہی اپنے رشتے داروں اور تعلیمی اداروں کے حصوں میں کوئی کمی بیشی کی۔ تاہم 25 اکتوبر 1940ء کو دہلی کی قانون ساز اسمبلی سے محمد علی جناح نے وصیت کے ہمراہ ایک تتمہ لکھا جسے وصیت کے ساتھ ملا کر پڑھا جانا تھا۔ یہ ہدایت نامہ یا ضمیمہ ان کے حصص، سرمایہ کاری اور بینک اکاؤنٹس کی بابت تھا۔ مذکورہ ضمیمہ تحریر کرنے کے وقت اُن کی زیادہ تر کیش رقوم دہلی اور بمبئی کے بینکوں میں تھیں۔ جب وہ پاکستان کے گورنر جنرل بنے تو اُن کی رقوم کا ایک بڑا حصہ اُن بینکوں کی کراچی برانچوں میں منتقل کیا گیا تھا لیکن پھر بھی بھارت میں رہ جانے والی کُل رقم کا حساب تاریخ کی کسی کتاب میں واضح نہیں ملتا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب قائدِاعظم محمد علی جناح 1939ء میں وصیت تحریر کر رہے تھے تو اُس وقت تک اُنھوں نے جناح ہاؤس لاہور اور کراچی یا ان

دونوں شہروں میں دیگر رہائشی پلاٹ نہیں خریدے تھے۔ وصیت تحریر کرتے وقت وہ جناح ہاؤس دہلی کے مالک تھے لیکن وہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں ہی فروخت کر دیا تھا۔ اُنھوں نے جناح ہاؤس بمبئی اپنی اہلیہ بیگم مریم جناح کو شادی کے وقت بطور تحفہ دے دیا تھا لیکن جب بیگم صاحبہ کا 1929ء میں انتقال ہو گیا تو مسلم عائلی قانون کے تحت جناح ہاؤس، مرحومہ کے واحد مسلمان بالغ وارث کے طور پر واپس قائد کو مل گیا۔ 1939ء میں اپنی حتمی وصیت میں اُنھوں نے یہ کوٹھی اپنی بہن فاطمہ جناح کے نام لکھ دی۔

جناح ہاؤس بمبئی کے علاوہ اُن کی باقی وصیت عمومی نوعیت کی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ قائداعظم اپنی زندگی میں جو جائیداد، مکانات، زمین اور حصص فروخت کر دیے اس سے وصیت متاثر نہیں ہوتی تھی۔ وصیت کا تعلق باقی رہ جانے والی جائیداد سے تھا جو قائد کی رحلت کے بعد ورثا میں تقسیم ہونی تھی۔ اُن کی بیٹی اور بہنوں کو تاحیات ایک طے شدہ رقم ملنی تھی اور ان میں ہر ایک کے انتقال کے بعد باقی ماندہ رقم قائد کی جائیداد میں شامل ہو جانی تھی۔

پانچ خواتین (ایک بیٹی اور چار بہنیں) کے لیے چھوڑی گئی رقوم اور چھے میں سے تین تعلیمی اداروں کو ایک ایک مرتبہ پچیس سے پچاس ہزار روپے تک ملنے والے فنڈز کے بعد بچ جانے والی رقم تین تعلیمی اداروں (ایک سکول، ایک کالج اور ایک یونیورسٹی) کو ملنا تھی۔ موخر الذکر اداروں کے لیے چھوڑی گئی رقوم کا حجم کئی ملین روپوں میں تھا، لیکن حتمی رقم کا دارومدار جناح صاحب کی رحلت کے سال اور تاریخ پر تھا۔ اگلے باب میں تعلیمی اداروں کے لیے چھوڑی جانے والی وراثت کا ذکر کیا جائے گا۔ یہاں ہم صرف خاندان کو ملنے والے حصے کے ذکر تک ہی محدود رہیں گے اور یہ وصیت کا چھوٹا حصہ ہے۔

قائدِاعظم کی وصیت سے سب سے زیادہ استفادہ کرنے والی شخصیت اُن کی بہن محترمہ فاطمہ جناح تھیں۔ اُنھوں نے اپنی وراثت کا خاطر خواہ حصہ (خاص طور پر بمبئی کا جناح ہاؤس) اپنی اس غیر شادی شدہ ہمشیرہ کے لیے چھوڑ دیا تھا جنھوں نے بیگم مریم جناح کی رحلت کے بعد اچھے برے حالات میں قائد کا ساتھ دیا تھا۔ یہ بات بھی زیر بحث

لائی جا چکی ہے کہ بھارت نے متروکہ جائیداد ایکٹ کے تحت جناح ہاؤس ضبط کر لیا تھا چنانچہ فاطمہ جناح کو اس کے بدلے پاکستان میں موہاٹا محل مل گیا۔ اس کے علاوہ جناح صاحب نے فاطمہ جناح کے لیے تاحیات ایک ہزار روپیہ ماہانہ آمدنی مقرر کی تھی جو اُنہیں زندگی بھر ملتی رہی۔ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد حکومتِ پاکستان نے موہاٹا محل اُن کی بڑی بہن شیریں جناح کے نام الاٹ کر دیا۔ شیریں جناح 1968ء میں اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بھارت سے پاکستان آئیں اور 1980ء میں اپنی رحلت تک یہیں قیام کیا۔ شیریں جناح کی وفات کے بعد اس موہاٹا محل کو بھی فلیگ سٹاف ہاؤس (جو ان کے مرحوم بھائی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ملکیت تھا) کی طرح عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ فلیگ سٹاف ہاؤس (دیکھئے باب 4) میں قائم عجائب گھر محمد علی جناح اور تحریکِ پاکستان کی یاد میں ہے لیکن موہاٹا محل (دیکھئے ضمیمہ د)، شیریں جناح کی خواہش پر فنونِ لطیفہ کے عجائب گھر میں تبدیل کیا گیا ہے جہاں مصوری اور خطاطی کے شاہ پاروں کی نمائش کی جاتی ہے۔

محمد علی جناح اپنی تینوں شادی شدہ بہنوں کے لیے تاحیات سو روپیہ ماہانہ آمدنی چھوڑ گئے تھے۔ پاکستان میں قائم جناح ٹرسٹ کو بھارتی بینکوں میں موجود جناح صاحب کے اکاؤنٹس تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ اگرچہ یقین کیا جاتا ہے کہ بھارت نے جناح صاحب کے اکاؤنٹس منجمد نہیں کیے ہوں گے۔ اگر ایسا ہوتا یہ ایک بڑا واقعہ ہونے اور دونوں ممالک کے درمیان تناؤ کا باعث بننے کی وجہ سے ریکارڈ پر ہوتا۔ یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ بھارت میں رہ جانے والی تینوں بہنیں (رحمت بائی، مریم بائی اور شیریں بائی) کو باقاعدگی سے ہر ماہ پیسے ملتے ہوں گے، لیکن یہ معاملہ بہرحال تاریخی جانچ کا متقاضی ہے۔ یہ بھی علم ہے کہ ان بہنوں میں سے ایک شیریں بائی 1968ء میں پاکستان منتقل ہو گئی تھیں۔ اُس وقت تک اُن کی دونوں بڑی بہنوں کا بھارت میں انتقال ہو چکا تھا۔ اسی طرح سب سے چھوٹی بہن فاطمہ جناح بھی پاکستان میں فوت ہو چکی تھیں۔ شیریں جناح نے اپنی زندگی کے آخری بارہ برس (1968-80ء) کراچی کے موہاٹا محل میں گزارے۔ شیریں جناح کو فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد قائدِ اعظم کی وصیت کی تعمیل کنندہ مقرر کر دیا گیا۔

قائدِ اعظم کی بہنوں سے کہیں زیادہ دلچسپ معاملہ بیگم محمد علی جناح کی اکلوتی بیٹی دینا واڈیا جناح کو ملنے والی وراثت کا ہے۔ نومبر 1938ء میں ایک غیر مسلم شخص نیول واڈیا سے شادی کرنے کے باوجود جناح صاحب نے اُنہیں اپنی وصیت سے عاق نہیں کیا تھا حالاں کہ یہ وصیت دینا کی شادی کے صرف چھے ماہ بعد لکھی گئی تھی۔ جناح صاحب کی وراثت کا ایک بڑا حصہ (دو لاکھ روپوں پر تاحیات منافع کی آمدن) بھی دینا جناح کے لیے چھوڑا گیا تھا۔ اس رقم کے حجم کا اندازہ لگانے کے لیے 1948ء میں ساٹھ ہزار ڈالروں کو آج ڈالر کے نرخ کے مطابق تبدیل کریں تو یہ کروڑوں روپے بنتے ہیں۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے دینا جناح کو ایک غیر مسلم سے شادی کرنے پر کبھی معاف نہ کیا اور بمشکل ہی کبھی اُن سے پھر ملے لیکن اُن کے لیے اتنی رقم ضرور چھوڑ گئے جس سے وہ شاندار زندگی بسر کر سکیں۔ جناح صاحب جانتے تھے کہ اگر اُن کی بیٹی ایک غیر مسلم کے نکاح میں رہیں تو وہ اُن سے براہِ راست وراثت حاصل نہیں کر سکیں گی۔ تاہم دینا نے شادی کے ساڑھے چار سال بعد 1943ء میں طلاق حاصل کر لی۔

مسلم عائلی قوانین کے مطابق وارث کا مذہب اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جناح صاحب جیسے قانون پر گہری نگاہ رکھنے والے شخص کے پیشِ نظر یہ بات ضرور ہوگی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ دینا واڈیا جناح نے اسلامی عقیدہ ترک کر دیا ہو۔ اصولی طور پر اگر والدین مسلمان ہوں تو اُن کا پیدا ہونے والا ہر بچہ مسلمان تصور ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ خود مذہب چھوڑ دے۔ مسیحیت اور زرتشت مذہب قبول کرنے کے لیے کچھ رسومات کا ادا کرنا ضروری ہے، جیسا کہ دینا کے سابق شوہر نیول واڈیا کے بارے میں علم ہے اُس نے پہلے بپتسمہ کے ذریعے مسیحیت قبول کی اور پھر نوجوت کی رسوم ادا کر کے دوبارہ پارسی مذہب قبول کیا۔ اس کے علاوہ بیگم مریم جناح کی قبولِ اسلام کی رسم کا بھی ریکارڈ موجود ہے۔ لیکن ایسا کوئی ثبوت نہیں کہ دینا نے کسی اور مذہب کو اختیار کرنے کی رسومات ادا کی ہوں، جیسا کہ بپتسمہ یا نوجوت وغیرہ۔

اگر دینا جناح، نیول واڈیا کے نکاح میں رہتیں تو وہ اپنے والد کی وصیت سے

محروم ہو جاتیں۔ اُن کی 1943ء میں ہونے والی طلاق کا مطلب تھا کہ وہ اپنے والد کی وفات کے وقت مسلمان تھیں کیوں کہ وہ کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں تھیں۔ چنانچہ قائد کی وفات کے بعد جب دینا کو اپنے والد کی وصیت میں دیے گئے اپنے حصے کا علم ہوا تو اُنھوں نے اس کی جلد وصولی کے لیے اصرار کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ وصیت پر عمل درآمد ہونے میں کچھ سال لگ گئے تھے۔ دینا کا خیال تھا کہ یہ تاخیر جان بوجھ کر کی جا رہی ہے۔ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد میں دینا واڈیا کے وہ خطوط محفوظ ہیں جن میں وہ اپنی پھپھو فاطمہ جناح سے درخواست کر رہی ہیں کہ وہ قائدِاعظم کی وصیت کے مطابق وراثت میں چھوڑی گئی رقم کی جلد منتقلی میں اُن کی مدد کریں۔

آرکائیوز میں موجود مارچ 1952ء کو لکھے گئے ایسے ہی ایک خط میں دینا اپنے لیے مختص کیے گئے فنڈز کی جلد از جلد منتقلی کی استدعا کرتے ہوئے لکھتی ہیں، ''کیا رقم کی ابھی منتقلی کا کوئی بندوبست ہو سکتا ہے؟'' دینا اپنی پھپھو فاطمہ جناح سے پوچھتی ہیں کہ ''کیا پاکستان میں ہونے والی تکلیف دہ دفتری کارروائی سے بالا ہی بالا وہ رقم اُنہیں براہِ راست لندن نہیں بھیجی جا سکتی؟'' وہ لکھتی ہیں، ''میرے دونوں بچے انگلستان میں سکول میں داخل ہیں۔ مجھے وہاں رقم کی ضرورت ہے۔'' چوں کہ دینا کے لیے چھوڑے گئے دو لاکھ روپے پاکستان میں حبیب بینک میں جمع تھے، اس لیے دینا جناح سے کہا گیا کہ وہ اسی بینک کی لندن کی برانچ میں اکاؤنٹ کھول لے۔ اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والی آمدنی دینا کے حبیب بینک لندن کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہی۔ اب جبکہ دینا واڈیا بھی فوت ہو چکی ہیں تو دینا کے لیے جمع کرائی گئی رقم واپس قائداعظم ٹرسٹ کے زیرِ نگرانی قائد کی وراثت میں جمع ہونا وصیت کا تقاضا ہے۔ وقتاً فوقتاً سندھ ہائی کورٹ جناح کے وراثتی معاملات کی نگرانی کرنے کے لیے ٹرسٹی نامزد کرتی رہی۔ آخری تین افراد سید ہاشم رضا، لیاقت ایچ مرچنٹ اور محمد حیات جونیجو تھے جو قائدِاعظم کی وصیت پر عمل درآمد کی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔

باب 14

قائد کی وصیت اور حل طلب معاملات

محمد علی جناح نے اپنی وصیت میں انجمنِ اسلام سکول بمبئی اور عربیک کالج نئی دہلی کے لیے فی کس پچیس ہزار روپے اور یونیورسٹی آف بمبئی کے لیے پچاس ہزار روپے چھوڑے تھے۔ ان تین تعلیمی اداروں اور اپنے خاندان (چار بہنیں اور ایک بیٹی) کے حصوں (جن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے) کے بعد بچ جانے والی جائیداد جیسے زمینوں اور مکانات کو فروخت کر کے حاصل شدہ رقم اور باقی ماندہ دولت شامل ہے، مزید تین تعلیمی اداروں کے نام کی گئی تھی۔ یہ تینوں موروث ادارے سندھ مدرستہ الاسلام سکول (موجودہ سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی) کراچی، اسلامیہ کالج (موجودہ اسلامیہ کالج یونیورسٹی) پشاور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناموں سے آج بھی قائم و دائم ہیں۔

بقایا ترکہ (Residuary inheritance) کو ایک طویل عرصے تک کسی نہ کسی وجہ سے فروخت یا حاصل نہ کیا جا سکا۔ وصیت پر عمل درآمد کروانے کے لیے جناح صاحب کے نامزد کردہ مختارِ خاص پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم لیاقت علی خان کو 1951ء میں قتل کر دیا گیا۔ دوسری تعمیل کنندہ قائدِاعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کا انتقال 1967ء میں ہو گیا۔ تاہم جناح ہاؤس ممبئی کا تنازع آج تک حل نہیں ہو سکا، لہٰذا اس کو قونصل خانہ بنانے یا فروخت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ جناح ہاؤس دہلی تو محمد علی جناح

نے خود ہی فروخت کر دیا تھا۔ جہاں تک کراچی اور لاہور کے جناح ہاؤسز کا تعلق ہے تو حکومتِ پاکستان اُنہیں فروخت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ درحقیقت حکومت نے جناح ٹرسٹ سے ازخود خرید کر ایک بنگلے کو قومی ورثے کا درجہ دے دیا۔ یعنی کراچی والی جناح منزل کو عجائب گھر میں تبدیل کر دیا گیا جب کہ لاہور والی جناح منزل افواجِ پاکستان کے استعمال میں برقرار رکھا گیا ہے۔ جناح ٹرسٹ کے لیے آسان کام محمد علی جناح کے گلبرک لاہور اور ملیر کراچی میں موجود پلاٹ اور زرعی زمین فروخت کرنا تھا، مگر یہ کام سرانجام دینے میں بھی کئی عشرے لگ گئے۔

جائیداد کا معاملہ وصیت کے مطابق نمٹانے میں اور بھی بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ وراثت میں حصہ دار نامزد کیے جانے والے چھے تعلیمی اداروں میں سے چار تقسیم کے بعد بھارت کی جغرافیائی حدود میں تھے اور یہاں پاک بھارت رقابت کا مسئلہ آڑے آتا رہا۔ اُن اداروں کے لیے جناح صاحب کی وراثت سے اپنا مجوزہ حصہ وصول کرنا آسان نہ تھا۔ دو مسلم ادارے انجمن اسلام سکول بمبئی (جس میں محمد علی جناح نے تعلیم حاصل کی تھی) اور عریبک کالج دہلی کہیں تاخیر سے 1967ء میں اپنے حصے کے مبلغ پچیس ہزار روپے وصول کر پائے۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ سے پیدا شدہ تلخی کی وجہ سے بمبئی یونیورسٹی نے اپنے حصے کے پچاس ہزار روپے کا فنڈ مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وہ محمد علی جناح کے وصیت کیے گئے حصے سے دستبردار ہوتے ہیں۔ چوں کہ بھارت میں واقع دیگر دونوں ادارے بھی 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد قائد کے عطیات وصول کر پائے تھے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وزیراعظم جواہر لال نہرو کی بہن وجایا لکشمی پنڈت نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے یونیورسٹی سینیٹ پر جناح کی وراثت کے حصے سے انکار کے لیے دباؤ ڈالا ہوگا۔ واضح رہے کہ 1960ء کی دہائی میں وہ بمبئی کی گورنر (اُس وقت اس کا نام ریاست مہاراشٹرا ہو چکا تھا) ہونے کے ناتے یونیورسٹی آف بمبئی کی چانسلر بھی تھیں۔ اگرچہ 65ء کی جنگ سے چند ماہ قبل وہ گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہو چکی تھیں لیکن ایسا

لگتا ہے کہ اُن کا اثر عہدے کے بعد بھی موجود رہا تھا۔

اس کے بعد ہمارے سامنے جناح کی وراثت سے سب سے بڑے حصہ دار تین ادارے ہیں: سندھ مدرستہ الاسلام، اسلامیہ کالج یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ جیسا کہ اوپر دیکھا گیا جناح صاحب کے باقی ماندہ ترکے کی مالیت اُن کی غیرمنقولہ جائیداد کو فروخت کیے بغیر متعین کرنا ناممکن تھا چنانچہ محترمہ فاطمہ جناح کی 1967ء میں وفات تک انہیں طے نہیں کیا جا سکا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی حیات میں 1962ء تک حکومتِ پاکستان اور جناح ٹرسٹ کی دلچسپی کا محور جناح ہاؤس بمبئی کی وراثت کے لیے لڑی جانے والی جنگ تھا کیوں کہ جناح صاحب کی جائیداد میں سب سے زیادہ مہنگی یہی عمارت تھی۔ اس کی فروخت سے قائدِ محترم کے قابلِ تقسیم ترکے میں اربوں روپوں کا اضافہ ہو جاتا کیوں کہ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد قائداعظم کی وراثت سے اُن کا حصہ بھی قائدِاعظم کے باقی ماندہ ترکہ میں دوبارہ شامل ہونا تھا۔

سندھ مدرستہ الاسلام کا حصہ

سندھ مدرستہ الاسلام نے جناح صاحب کی وصیت پر عمل درآمد کے لیے 1969ء میں سندھ اور بلوچستان ہائی کورٹ (جو اُس دور میں مشترکہ عدالتِ عالیہ ہوا کرتی تھی) کراچی میں متفرق درخواست نمبر 09/69 دائر کی۔ اکتیس مارچ 1972ء کو مذکورہ عدالت نے قائدِاعظم کی واحد زندہ بہن شیریں جناح کو وصیت کا نگران مقرر کرتے ہوئے درخواست نمٹا دی۔ اگرچہ رقوم کی کچھ اقساط جاری کی گئیں لیکن شیریں جناح کے 1980ء میں انتقال تک وراثت میں ادارے کا ایک بڑا حصہ ادا نہیں کیا گیا تھا۔ نیز شیریں جناح محمد علی جناح کی چار بہنوں میں سے وارثت کی آخری وصول کنندہ تھیں۔ اُن کی وفات کے ساتھ ہی جناح صاحب کی تمام رقوم، بانڈز اور سرمایہ کاری جناح ٹرسٹ کے پاس واپس چلی گئیں، سوائے اُن کے جو اُن کی بیٹی دینا جناح کے لیے مختص تھیں۔ سندھ ہائی کورٹ نے فیصلہ سنا دیا کہ قائدِاعظم کی تمام جائیداد فروخت کر کے وصیت پر مکمل عمل درآمد کیا جائے

لیکن اس میں بھی مزید ایک عشرہ لگ گیا۔

1990ء کی دہائی تک باقی جمع کردہ رقم 32,434,800 روپے (اُس وقت کرنسی کے نرخوں کے مطابق تقریباً 1.1 ملین ڈالر) تھی اور اسے اسلامیہ کالج، سندھ مدرستہ الاسلام اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مساوی تقسیم کرنا تھا۔ اس لحاظ سے تینوں اداروں کا فی کس حصہ 10,811,600 روپے بنتا تھا۔ راقم الحروف نے تحریری طور پر یونیورسٹی انتظامیہ سے سندھ مدرستہ الاسلام کو قائدِاعظم کی وصیت اور ملنے والی رقوم کی بابت استفسار کیا تو اُنھوں نے اس کے جواب میں ادارے کے سابق وائس چانسلر علی محمد شیخ کی تحریر کردہ کتاب ''قائدِاعظم محمد علی جناح: تعلیم، جدوجہد اور کارنامے'' بھجوائی اور اس کا حوالہ دینے کا مشورہ دیا۔ سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کے بارے میں معلومات مذکورہ کتاب سے لی گئی ہیں۔ اس کے مطابق سندھ مدرستہ الاسلام یونیورسٹی کو سندھ ہائی کورٹ کے حکم نامے تک 1956ء میں 350,000 روپے پہلی قسط، 1962ء میں 100,000 روپے دوسری قسط اور 1972ء میں 260,000 روپے تیسری قسط کی مد میں ملے تھے۔ یہ کل 710,000 روپے ادارے کے لیے قائد کے ایک کروڑ سے زائد کے واجب الادا ترکے کا صرف 6.5 فیصد تھے۔

1972ء میں سندھ مدرستہ الاسلام کو قومی تحویل میں لے کر اس کی نجی انتظامیہ کو تحلیل کر دیا گیا۔ سندھ مدرسہ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق باقی 93 فیصد حصہ 1980ء کے ہائی کورٹ کے حکم نامے کے بعد اُس وقت کے بورڈ کے ممبران کو، جن میں عبدالرزاق تھہیم، امداد حسین کیچر، ایم این عقیلی اور جی ایم شاہ شامل تھے، ذاتی حیثیت میں وصول ہوا ہو تو ہو، لیکن ادارے کو بذاتِ خود مزید کچھ نہیں ملا۔ دوسری طرف جناح ٹرسٹ کا اصرار ہے کہ اُنھوں نے سندھ مدرستہ الاسلام کے انتظامی بورڈ کو قائد کے ترکہ کے 10,811,600 روپے میں سے پہلی تین اقساط کے بعد کے تمام بقایا جات منتقل کر دیے تھے اور اب اس کے ذمہ واجب الادا کچھ نہیں ہے۔ واللہ العلم!

اسلامیہ کالج پشاور کا حصہ

اسلامیہ کالج پشاور قدرے خوش قسمت ثابت ہوا۔ اس کی سرکاری ویب سائٹ کے مطابق اسے 1994ء تک مختلف اقساط میں قائد کے ترکہ سے اپنا حصہ مل گیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

25 اکتوبر 1960ء کو 450,000 روپے بطور پہلی قسط، 7 جولائی 1980ء کو 1,000,000 روپے بطور دوسری قسط، 18 اپریل 1982ء کو 1,000,000 روپے بطور تیسری قسط، 26 اگست 1987ء کو 7,850,000 روپے بطور چوتھی قسط اور آخری قسط کے طور پر 10 اپریل 1994ء کو 511,660 روپے ملے۔ چوتھی اور آخری قسط کے سوا باقی تمام رقوم پشاور یونیورسٹی کے نام بھیجی گئیں کیوں کہ اسلامیہ کالج اسی یونیورسٹی سے الحاق رکھتا تھا۔ تاہم اسلامیہ کالج کا موقف ہے کہ جناح وصیت کا حقدار اسلامیہ کالج پشاور تھا نہ کہ جامعہ پشاور۔ ممکن ہے کہ مذکورہ یونیورسٹی نے پہلی تین اور پانچویں قسط سے کچھ رقوم منہا کی ہوں۔ اس دوران اسلامیہ کالج پشاور کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا اور اب یہ پشاور یونیورسٹی سے الحاق نہیں رکھتا ہے۔ دونوں جامعات کے مابین یہ معاملہ ابھی حل طلب ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا حصہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہیکٹر بولیتھو کانجی دوارکا داس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جناح صاحب کی وصیت پر عمل درآمد کے ذمہ دار اُس وقت کے وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان سے اپنے حصے کی وصولی کے لیے احتجاج کیا تھا۔ تاہم بھارت میں واقع دیگر اداروں کی طرح اسے بھی 1960ء کی دہائی کے اختتام تک رقم نہیں ملی تھی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ سے دونوں ملکوں کے درمیان ماحول کشیدہ ہو گیا۔ اُسی سال بھارتی پارلیمنٹ نے یونیورسٹی ایکٹ 1920ء میں دو مرتبہ ترمیم کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیادی جہت تبدیل کر دی۔ اب یہ ادارہ ویسا نہیں رہا جس کا تصور اس کے بانیوں نے کیا تھا یعنی یہ نئے قانون کے تحت صرف

مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے وقف ادارہ نہیں رہا۔ اسے دیکھتے ہوئے پاکستانی عدالتوں نے فیصلہ کیا کہ نئی علی گڑھ یونیورسٹی اب حصہ وصول کرنے کی حقدار نہیں کیوں کہ اب یہ وہ ادارہ نہیں ہے جس کے لیے جناح صاحب رقم چھوڑ کر گئے تھے۔

1980ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے مخصوص ترکے کی رقم مبلغ 10,811,600 روپے میں سود کی مد میں ملنے والے 600,000 روپوں کا سالانہ اضافہ ملنا شروع ہو چکا تھا۔ سندھ ہائی کورٹ نے 1984ء میں فیصلہ کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے مختص یہ رقم پاکستان رکھ سکتا ہے لیکن اسے صرف تعلیمی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا جائے۔ اس طرح 10.8 ملین روپوں سے ''قائدِ اعظم علی گڑھ سکالرشپ'' قائم کیا گیا۔ یہ وہ رقم تھی جو علی گڑھ یونیورسٹی کو ادا کی جانی تھی۔ 2018ء تک اس فنڈ کا حجم سالانہ منافع کی وجہ سے 45,000,000 روپے ہو چکا تھا۔ اس سے پاکستان بھر میں غریب، مستحق اور حقدار طلبہ کو میرٹ پر 7,500 وظائف دیے جا چکے ہیں۔ یہ وظائف اور جناح سکالرز قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زندہ و تابندہ وراثت کے طور پر موجود ہیں۔

اختتامیہ

قائدِ اعظم محمد علی جناح کی جائیداد کا مطالعہ اُن کی وراثت کے مختلف گوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ قائد کے چھوڑے ہوئے مکانات، اُن کا ڈیزائن، تزئین و آرائش بانیٔ پاکستان کی شخصیت اور ذوق کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ جناح صاحب کے اپنی مرحومہ اہلیہ سے پیار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بمبئی والے جناح ہاؤس سے اتنا جذباتی لگاؤ کیوں رکھتے تھے جبکہ اُنھوں نے دہلی والا مکان فروخت کرنے میں لمحہ بھر توقف نہیں کیا تھا۔ قیمت کے اعتبار سے جناح منزل بمبئی چاروں جناح منزلوں میں مہنگا ترین ہے۔ قائد کو بمبئی شہر سے محبت تھی اور اُن کی پہلی اور آخری محبت بھی اسی شہر میں اپنی آخری آرام گاہ میں مدفون ہے۔ ممبئی کہلانے والے اس شہر میں محمد علی جناح کی دیگر نشانیوں میں پیپلز جناح ہال اور خوجہ مسلم قبرستان مزگاؤں میں بیگم مریم جناح کا مقبرہ ہے۔ بیگم مریم جناح کا تعلق ان تینوں یادگاروں سے بنتا ہے۔ وہ جناح ہاؤس کی مالکن تھیں؛ پیپلز جناح ہال اُن کی اور اُن کے شوہر کی دلیری کی یاد میں تعمیر کیا گیا تھا اور وہ مذکورہ مزار میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔

2008ء کے ممبئی حملوں کے بعد جناح ہاؤس پر بات چیت کا رخ کافی حد تک پاکستان مخالف ہو گیا کیوں کہ ان حملوں کی ذمہ داری بھارت کی طرف سے مبینہ طور پر کسی پاکستانی جہادی گروہ پر عائد کی جاتی ہے۔ بھارت کی کچھ سیاسی جماعتوں نے پھر سے

مطالبہ دہرانا شروع کر دیا ہے کہ تاریخی جناح منزل کو منہدم کر دیا جائے، یا کم از کم اسے ''دشمن کی جائیداد'' قرار دے دیا جائے۔ بھارتی دستور ساز اسمبلی میں بجٹ کی ضروریات پر بات کرتے ہوئے حکمران جماعت ایم ایل اے کے منگل پربت لودھا نے دعویٰ کیا کہ کہنے کو تو ساؤتھ کورٹ محمد علی جناح کا بنگلہ تھا لیکن اس کی دیکھ بھال بھارت کا پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کرتا ہے جس پر ستر سال سے بھارتی عوام کے سالانہ لاکھوں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اُس نے ان الفاظ کے ساتھ اس کے انہدام کا مطالبہ کیا، ''جنوبی ممبئی میں محمد علی جناح کا گھر وہ جگہ تھی جہاں تقسیم کے منصوبے نے جنم لیا.... جناح منزل تقسیم ہند کی علامت ہے۔''

حزبِ اختلاف کانگرس پارٹی نے لودھا اور بی جے پی پر ایک خاندان کے مسئلے کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کا الزام لگایا۔ کانگرس پارٹی کے ترجمان سچن ساونت کا کہنا تھا، ''یہ یقیناً ایک سلگتا ہوا سیاسی مسئلہ بننے جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ رکن اسمبلی مسٹر لودھا خود ایک بلڈر یعنی تعمیرات کا سرمایہ کار ہے جو اس جائیداد میں ذاتی مفاد رکھتا ہے۔ بی جے پی اقتدار میں ہے اور وہ اس جائیداد کے مسئلے سے نمٹنا چاہیں تو حل کر سکتے ہیں۔ تو پھر اُن کے رہنما میڈیا میں کیوں افواہیں اُڑا رہے ہیں؟'' قصہ مختصر بھارت میں آج بھی قائداعظم کی جائیداد پر سیاسی گرما گرمی اور قانونی جنگیں موجود ہیں۔

ممبئی حملوں کے پیچھے جس کا بھی ہاتھ تھا، یہ بات سمجھنے کے لیے زیادہ بقراط ہونے کی ضرورت نہیں کہ قائداعظم کے ان حملوں پر احساسات کیا ہوتے۔ وہ ممبئی شہر سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس سے بھی افسوس ناک یہ حقیقت ہے کہ ممبئی کے تاج محل ہوٹل میں بیگم مریم جناح نے قائدِاعظم کو شادی کی پیشکش کی تھی۔ مزگاؤں کے علاقے آرام باغ میں بیگم صاحبہ مدفون ہیں۔ اور یہ دونوں مقامات ہی حملوں کا نشانہ بنے تھے۔ پاکستان ایک پُرامن اور ذمہ دار ریاست ہے جو بین الاقوامی قوانین کا احترام کرتی ہے۔ لہٰذا بھارت کا یہ الزام کہ کسی بھی حملہ آور کو پاکستان کی پشت پناہی حاصل تھی، یکسر غلط ہے۔ البتہ یہ پاکستان و بھارت اور بالخصوص ممبئی شہر کے عوام کا فرض ہے کہ وہ انتہا پسندی اور سرحد کے

دونوں طرف نفرت کے بیج بونے والوں کے مقاصد کو شکست دیں۔

دوسری طرف، بھارت کی حکومت اور سیاست دانوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ بیگم و محمد علی جناح کے ممبئی کے ساتھ تعلق کو منہدم کرنے کی بجائے اس تعلق کا جشن منانا چاہیے۔ یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ عمارت کے ڈھانچے کو تو گرایا جا سکتا ہے لیکن تاریخ کو نہیں۔ جہاں تک جناح ہاؤس کا تعلق ہے تو پاکستان اور بھارت کو دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے تین چوتھائی صدی سے التوا کا شکار اس معاملے کا قابلِ قبول حل تلاش کرنا چاہیے۔

زیرِنظر کتاب کا حاصلِ کلام یہ ہے کہ قائداعظم کی دولت اور جائیداد کے اجمالی جائزے سے یہ باتیں بدرجہ اتم عیاں ہوتی ہیں:

اوّلاً، قائداعظم حق حلال کے ذرائع سے پیسہ بنانے میں مہارت رکھتے تھے، وکیل تھے تو چوٹی کے، سرمایہ کار تھے تو انتہائی پیش بین اور سرمایہ کار تھے تو مہا عقل مند۔

دوئم، آپ کشادہ مکانوں اور اس کے گرد خوب صورت باغات کے دلدادہ تھے۔

سوئم، آپ کو ریاکاری اور دکھاوے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ہر چیز باوقار مگر سادہ رکھتے تھے۔

چہارم، آپ فضول خرچ ہرگز نہ تھے، پائی پائی کا حساب رکھتے۔ ہر رقم کا آڈٹ کرواتے اور گورنر جنرل پاکستان بننے کے بعد بھی سرکاری ہاؤس کی فاضل بتیاں خود بند کرتے رہتے تاکہ ملکی بجلی کا ضیاع نہ ہو اور نہ ہی عوام کے ٹیکس کی رقم کا۔

پنجم، ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتے، یہاں تک کہ بطور گورنر جنرل پاکستان آپ کی 4 ہزار روپے ماہانہ آمدن سے ڈیڑھ گنا یعنی 6 ہزار سے زائد تو ٹیکس کی مد میں کٹوا دیتے تھے۔

ششم، آپ نے تمام عمر مفادِ عامہ کے صنعتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی اور مسلمان کمپنیوں میں دل کھول کر پیسہ لگایا تاکہ مسلمانانِ ہند ترقی کی منازل طے کریں۔

ہفتم، آپ نے ترکے میں سے تمام بہنوں کے لیے تاحیات ذرائع آمدن

ضمیمہ جات

خاندان جناح کا تعمیراتی نقش پا

یہ اُن پانچ عظیم عمارات کی کہانیاں ہیں جو قائدِ اعظم کی ملکیت تو نہ تھیں لیکن بانیٔ پاکستان سے ان کو گہری نسبت ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی

چھوڑے۔ چوں کہ محترمہ فاطمہ جناح غیر شادی شدہ تھیں اور آپ پر انحصار کرتی تھیں، ان کے لیے سب سے زیادہ جائیداد چھوڑی۔ نافرمان بیٹی کو بھی عاق نہ کیا بلکہ اس کی شادی کے محض 6 ماہ بعد مکمل کی گئی وصیت میں اس کے لیے لاکھوں کا مال اور تاحیات آمدن چھوڑ گئے۔

ہشتم، آپ نے اپنی جائیداد کا 90 فیصد حصہ مسلمانانِ پاک و ہند کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔ 6 اہم ترین تعلیمی اداروں کے نام اپنا بیشتر ترکہ چھوڑ گئے کیوں کہ سرسید کے بعد صرف محمد علی جناح ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں کی ترقی میں تعلیم کی اہمیت کو بھانپ لیا تھا۔ آج پاکستان میں ہزاروں سکول و کالج اور یونیورسٹیاں یونہی تو جناح کے نام پر نہیں ہیں۔

نہم، آپ نے دیانت داری اور کفایت شعاری کی مثالیں رقم کیں۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ ایمان داری سے محنت کے ساتھ انتہائی غربت سے دولت مندی کا سفر ممکن ہے۔ اس دولت کو عیاشی کی نذر نہ کیا بلکہ اپنی قوم کی فلاح کے لیے وقف کر گئے۔

آخر میں، آپ اخلاقی، سیاسی، مالی اور قانونی لحاظ سے کردار کا وہ معیار چھوڑ گئے کہ مسلمانانِ ہند میں قائداعظم محمد علی جناح سے پہلے اور آپ کے بعد آپ کا مقابلہ کرنے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہو سکا۔

اس کتاب کو قائداعظم سے منسوب تعمیرات کے متعلق حوالہ جاتی کتاب بنانے کی غرض سے ضمیمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے جس میں ایسی پانچ عمارات کا ذکر ہے جو قائداعظم کی ملکیت نہ ہونے کے باوجود ان سے نسبت رکھتی ہیں یعنی وہ مکان جہاں ان کی ولادت، علالت یا رحلت ہوئی۔ امید ہے کہ اس کتاب سے قائداعظم محمد علی جناح سے منسوب تمام مکانات و مقامات سے متعلق تشنگی ختم ہونے میں مدد ملے گی۔

آئندہ صفحات راقم الحروف کے ایک طویل انگریزی مقالہ بعنوان ''Architectural Imprints of Jinnah Family in Sind'' جو پہلی بین الاقوامی کانفرنس برائے مطالعہ سندھ منعقدہ 20-21 نومبر 2017ء زیر اہتمام سندھ یونیورسٹی جامشورو میں پڑھا گیا، کے ترجمہ و تلخیص پر مشتمل ہیں۔ مقالہ میں قائدِاعظم سے منسوب اُن تعمیرات پر تحقیق تھی جو صوبہ سندھ میں قائم ہیں۔ تاہم کتاب کے موضوع کی مناسبت سے زیارت ریذیڈنسی پر باب کا اضافہ کیا گیا ہے جو کہ صوبہ بلوچستان میں واقع ہے۔

ضمیمہ الف

وزیر مینشن، کراچی

(مکانِ ولادت)

نوآبادیاتی دور کی یہ تین منزلہ عمارت چھاگلہ گلی (اب یہ برکاتی سٹریٹ کہلاتی ہے) کھارادر کراچی میں کھڑی ہے۔ اصل عمارت غالباً 1870-1860ء کے دوران بنی تھی اور اس کی تعمیر میں چونا اور پتھر استعمال کیا گیا تھا تاکہ کراچی کے شدید موسم کا مقابلہ کر سکے۔ اب تک یہ بات تاریخی طور پر طے ہو چکی ہے کہ قائدِاعظم اسی تین منزلہ مکان میں پیدا ہوئے اور 1892ء میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن جانے سے پہلے اُنھوں نے اپنے بچپن اور نوجوانی کے سولہ سال یہیں بسر کیے تھے۔(1)

قائد کا آبائی خاندان صوبہ گجرات جو اُس وقت بمبئی پریذیڈنسی کا حصہ تھا، سے تعلق رکھتا تھا۔ تاہم اُن کے والد جناح بھائی پونجا ایک انگریز تجارتی فرم گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے ساتھ شراکت داری کی وجہ سے کراچی میں آکر آباد ہو گئے کیوں کہ اس کمپنی کا دفتر اسی شہر میں تھا۔ اُنھوں نے اپنی شادی کے ساتھ ہی ایک مکان (جو آج کل ''وزیر مینشن'' کہلاتا ہے) 1874ء میں کرائے پر لیا اور اپنی بیشتر شادی شدہ زندگی اس میں بسر کی جہاں اُن کے ساتوں بچے پیدا ہوئے۔ اُن میں سے سب سے پہلے محمد علی جناح تھے جنھوں نے 1876ء میں آنکھ کھولی۔ جب مالی حالات نے اجازت دی تو یہی مکان خرید لیا۔ قائدِاعظم کی تعلیم کے لیے

برطانیہ روانگی کے بعد جناح پونجا کی زندگی میں کئی ایک بھونچال آئے جن میں اُن کی اہلیہ مٹھی بائی (یعنی قائد کی والدہ) کے انتقال کے علاوہ کاروبار کا دیوالیہ اور اُن کا انتہائی مقروض ہونا شامل تھا۔ چنانچہ 1899ء یا 1900ء میں وہ جائیداد فروخت کر کے کراچی شہر کو خیر آباد کہہ کے چلے گئے۔ دریں اثنا قائدِ اعظم تعلیم مکمل کر کے وکیل بن چکے تھے۔ رفتہ رفتہ آپ نے والد کے تمام قرضے لوٹائے، اُن کے خلاف کراچی کی عدالتوں میں مقدمات اور دعوے نمٹائے اور والد اور بہن بھائیوں کو بمبئی لے گئے جہاں پونجا جناح 17 اپریل 1902ء میں انتقال کر گئے۔

پیچھے کراچی میں یہ مکان دو اور ہاتھوں سے ہوتا ہوا کراچی کے قدیم باشندے اور کپڑے کے تاجر گوار دھن داس نوتن داس کی ملکیت ہو گیا۔ غالباً اُس نے پرانے مکان کو گرا کر تعمیر نو کروائی ہو گی کیوں کہ موجودہ ڈھانچہ کسی طور پر پونے دو سو سال پرانا نہیں لگتا۔ واضح رہے کہ قیام پاکستان تک کراچی کی اکثریت غیر مسلم تھی اور اگست 1947ء میں شہر کی چار لاکھ آبادی میں بمشکل ایک لاکھ ہی مسلمان ہوں گے۔

عین تاریخ تو دستیاب نہیں لیکن 1940ء کی دہائی میں کسی وقت پونا (بمبئی) سے آنے والے ایک مسلمان تاجر وزیر علی، جو رنگ و روغن کا کاروبار کرتے تھے، نے یہ جائیداد خرید لی۔ وہ اپنے آبائی شہر کی مناسبت سے وزیر علی پونا والا کہلاتے تھے۔ اُنھوں نے 25 ہزار روپے کی قیمت میں مکان خریدا، رنگ اور مرمت کروا کے اپنے نام کے گھر پر ''وزیر مینشن'' کا بورڈ لگا دیا۔ خواجہ رضی حیدر کی کتاب ''قائدِ اعظم شناسی'' سے اشارہ ملتا ہے کہ اس جائیداد کی منتقلی 29 اکتوبر 1947ء کو قیام پاکستان کے کچھ ہی بعد ہوئی تھی جو کہ قرین قیاس بھی ہے۔ ایک طرف ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے لاکھوں ہندو بھارت نقل مکانی کر گئے تو دوسری طرف ہندوستان سے آنے والے مسلم مہاجرین رہائش کے متلاشی تھے اور اہل ثروت مسلمانوں نے جانے والے ہندوؤں کی جائیدادیں خریدی تھیں۔ شاید یہی سلسلہ وزیر علی اور گوار دھن داس کے درمیان پیش آیا ہو۔ بہر حال یہ طے ہے کہ عمارت کا نام وزیر مینشن پاکستان کے قیام کے بعد پڑا۔

جب 11 ستمبر 1948ء کو قائدِ اعظم کا انتقال ہوا تو کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا اور تمام مرکزی وزارتیں یہیں قائم تھیں۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات نے اپنے رسالے ''ماہِ نو'' کے اکتوبر ایڈیشن کو قائدِ اعظم نمبر کے طور پر شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ پرنسپل انفارمیشن آفیسر کرنل مجید نے نوجوان صحافی فضل حق قریشی (1909-99) کو کراچی میں قائدِ اعظم کی جائے پیدائش تلاش کرنے کا کام سونپا۔ کھارادر میں پوچھتے پچھاتے کھلنانی بلڈنگ میں قائداعظم کی رشتے کی بھاوج فاطمہ بائی سے ملاقات ہو گئی جو اُس وقت 86/87 برس کی تھیں۔ وہ قائدِ اعظم کے تایا زاد بھائی گانجی والجی کی اہلیہ تھیں اور وہ 1885ء میں بیاہ کر اُسی گھر میں آئی تھیں (موجودہ وزیر مینشن) جہاں نو سالہ قائدِ اعظم بھی رہتے تھے۔ واضح رہے کہ کراچی آمد پر قائدِ اعظم کے والد (جناح پونجا) اور تایا (والجی پونجا) اپنے اپنے کنبے کے ساتھ اسی ایک مکان میں رہتے تھے اور والجی پونجا اینڈ کمپنی کے ذریعے کاروباری شراکت دار تھے۔

فاطمہ بائی سابقہ نیو نہم روڈ پر چھاگلہ سٹریٹ کے نکر پر لے آئیں جہاں اُن کی جوانی اور قائد کا بچپن گزرا تھا۔ تب وزیر مینشن نامی بنگلے میں اوپر وزیر علی پونا والا کا خاندان اور نیچے کپڑے کے آڑھتیوں کی دکانیں قائم تھیں۔ فضل حق قریشی نے قائدِ اعظم کے مکانِ پیدائش کی یہ دریافت ''ماہ نو'' میں وزارتِ اطلاعات کے سرکاری فوٹو گرافر میاں ظہور کی لی گئی تصاویر کے ساتھ شائع کر دی۔

مشہور سی ایس پی افسر ہاشم رضا (سابق ایڈمنسٹریٹر کراچی اور کتاب ''ہماری منزل'' کے مصنف) کو سرکاری طور پر قائد کی جائے پیدائش کی تصدیق کا حکم ملا۔ مزید تحقیق، بلدیہ کے ریکارڈ، مالکان کی پڑتال اور قائدِ اعظم کے اقربا کی گواہیوں سے یہی جگہ ثابت ہوئی اور فاطمہ جناح نے بھی آ کر علاقہ اور مکان (اگرچہ اس کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی) سرکاری افسران کی موجودگی میں پہچان لیا۔ دریں اثنا 1951ء تک کراچی میں سات لاکھ مسلمان مہاجرین کی ہندوستان سے آمد، نوکری کی تلاش میں دیگر صوبوں سے دارالحکومت کراچی میں نقل مکانی اور ہندو برادری کے انخلا سے یہ دس لاکھ کی آبادی کا مسلم اکثریتی شہر بن چکا تھا۔

1953ء میں حکومتِ پاکستان نے Ancient Monuments مجریہ Preservation Act,1904 کے تحت وزیر مینشن کی عمارت حاصل کرلی اور اس کے عوض اُس وقت کے مالک علاؤالدین وزیر علی کو متبادل عمارت فراہم کردی۔ مالک کے نام سے عندیہ ملتا ہے کہ شاید وہ وزیر علی پونا والا کے صاحبزادے ہوں گے۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ (پی ڈبلیو ڈی) کو اس کے تحفظ اور تزئین وآرائش کی ذمہ داری سونپی گئی جس نے چند ماہ میں یہ ذمہ داری مکمل کرلی۔ اس کے بعد محمد علی جناح کی جائے پیدائش کی مناسبت سے عجائب گھر کے طور پر اس کا افتتاح چودہ اگست 1953ء کو کیا گیا۔

نصف صدی بعد 2010ء میں حکومتِ پاکستان نے وزیر مینشن کی مرمت، حفاظت اور بحالی کا ایک اور منصوبہ مکمل کیا۔ اب قائد سے منسوب یہ میوزیم ایک سہ منزلہ عمارت ہے جس میں ایک کتب خانہ اور عجائب گھر کی گیلریاں ہیں۔ اکتوبر 2016ء میں معروف کاروباری شخصیت اور بحریہ ٹاؤن کے مالک ملک ریاض نے اپنے خرچ پر اس عمارت کی تزئین نو کروا کر اسے عوام کے لیے از سرِ نو کھولنے کی پیش کش کی۔ تاحال اُن کی پیشکش پر کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

اگرچہ وسیع تر اتفاقِ رائے یہی ہے کہ قائد کراچی کے ضلع میں پیدا ہوئے تھے۔ تاہم یہاں اُن کی جائے پیدائش پر ایک تنازع کا ذکر برمحل ہوگا۔ سندھی ادبی بورڈ کی 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں شائع کردہ درسی کتب میں بابائے قوم کی جائے پیدائش جھرک کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز کی تحریر کردہ یہ کتب سندھ میں پرائمری سکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ جھرک موجودہ ضلع ٹھٹھہ میں ہے۔ برطانوی راج میں ٹھٹھہ ضلع کراچی کی تحصیل تھی۔

جھرک والے قصہ کی جڑیں دو معاملات سے ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ وزیر مینشن قائداعظم کی سنہ پیدائش سے بہت بعد میں تعمیر ہوا اور دوسرے یہ کہ قائداعظم کے نانا (جعمہ موسیٰ) اور اُن کا خاندان 1870ء کی دہائی میں جھرک کے گاؤں میں قیام پذیر رہا تھا۔ اگرچہ دونوں باتیں درست ہونے کا امکان ہے لیکن اس سے قائداعظم کا جھرک میں پیدا ہونا

ثابت نہیں ہوتا۔ ایک طرف تو قائداعظم کی پیدائش پر والدہ مٹھی بائی کا میکے جانے کا کوئی ثبوت یا حوالہ موجود نہیں۔ دوسری طرف گوردھن داس کی طرف سے مکان کو از سرِ نو تعمیر کروانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قائداعظم اسی مقام پر موجود 1860ء میں تعمیر شدہ پرانے مکان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ درج بالا بحث کی روشنی میں بشمول اس بات کے کہ قائداعظم نے خود اپنے پاسپورٹ اور تعلیمی اسناد پر جائے پیدائش کراچی ہی درج کی ہے، یہ امر مسلمہ حقیقت ہے کہ قائداعظم سابقہ نیونہم روڈ کی برکاتی سٹریٹ کے اس مقام پر واقع مکان میں پیدا ہوئے جو کہ تعمیر نو، فروخت اور آرائش کے مختلف ادوار سے گزرنے کے بعد آج وزیر مینشن میوزیم کہلاتا ہے۔

تاریخ شواہد مانگتی ہے اور قیاس آرائیوں کی بنیاد پر مؤرخ حقائق تبدیل نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دورِ حکومت میں قائداعظم کی اصل جائے پیدائش کا تعین کرنے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی کی تحقیقات نے اسی معروف تصور پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ قائد کی پیدائش جھرک میں نہیں بلکہ کراچی کے علاقے کھارادر میں وزیر مینشن میں ہوئی تھی۔

تاہم مورخ اور سی ایس پی آفیسر کلیم اللہ لاشاری کے مطابق پونجا جناح وزیر مینشن سے ملحق ایک اور مکان کی ملکیت بھی رکھتے تھے جہاں آج کل علی منزل نامی عمارت کھڑی ہے جو کہ 1876ء میں وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ کلیم لاشاری کا خیال ہے محمد علی جناح اسی عمارت میں پیدا ہوئے تھے۔ تاہم علی منزل 1950ء کی دہائی میں تعمیر ہونے والی ایک نئی عمارت ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کا پلاٹ جو قائد کے والد کی ملکیت تھا، کبھی وزیر مینشن کا حصہ رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو محمد علی جناح کی جائے پیدائش پر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

ضمیمہ ب

قائدِاعظم ریذیڈنسی، زیارت

(مکان علالت)

1870ء کی دہائی کے بعد سے برطانوی راج کی انتظامیہ بلوچستان میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہی تھی۔ آخر کار ایک انگریز ریذیڈنٹ (یہ عہدہ بعد میں چیف کمشنر کہلانے لگا) اور اس کے ماتحت ایک فوجی دستہ کوئٹہ میں تعینات ہوگیا۔ کوئٹہ کے شمال مشرق میں 133 کلومیٹر کے فاصلے پر صوبے کے ایک بلند پہاڑی سلسلے پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے زیارت کو برطانوی انتظامیہ نے موسم گرما کے لیے اپنا دارالحکومت چنا۔ 1892ء میں اس قصبے میں آٹھ ہزار مربع فٹ پر لکڑی کی ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کی گی جس کو برطانوی فوجی اہلکاروں کے لیے پرفضا علاج گاہ Sanatorium کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ بعدازاں انتظامی ضروریات کے سبب اس کی حیثیت تبدیل کر کے اسے انگریز ریذیڈنٹ کی موسم گرما کی قیام گاہ قرار دے دیا گیا۔ اس طرح عمارت کا نام ریذیڈنسی یعنی صاحب بہادر ریذیڈنٹ کی رہائش گاہ پڑ گیا۔

زیارت شہر سطح سمندر سے 2,543 میٹر (یعنی 8,346 فٹ) بلند ہے اور ایک مسلمان بزرگ کی زیارت یعنی مزار سے منسوب ہے۔ اس بلندی پر موسم انتہائی سرد ہوتا ہے اور موسم سرما میں پارہ منفی اٹھارہ تک گر جاتا ہے۔ یہ حسین مقام 110,000 ایکڑ پر اُگے

مزارِ قائد

دورانِ تعمیر مزارِ قائد

یحییٰ مرچنٹ بمبئی کے مشہور مسلمان آرکیٹیکٹ، قائداعظم کے مشیر تعمیرات اور ذاتی دوست۔ فاطمہ جناح کی خواہش پر ان کی خدمات مزارِ قائد کے ڈیزائن کے لیے حاصل کی گئیں

جناح منزل کراچی (موجودہ قائداعظم ہاؤس میوزیم)

جناح منزل لاہور (موجودہ کورکمانڈر ہاؤس)

جناح منزل ممبئی (سابقہ سا ؤتھ کورٹ)

جناح منزل دہلی (موجودہ رہائش گاہ ولندیزی سفیر برائے جمہوریہ بھارت)

انجمن اسلام سکول ممبئی جہاں قائداعظم اوران کے بھائی احمد علی جناح نے تعلیم حاصل کی۔
قائداعظم نے اپنی وصیت سے 25 ہزار روپے اس سکول کے نام کیے

یونیورسٹی آف بمبئی۔ قائداعظم نے اپنی وصیت میں 50 ہزار روپے اس یونیورسٹی کے لیے چھوڑے

عریبک کالج دہلی۔ قائداعظم نے اپنی وصیت میں 25 ہزار روپے اس کالج کے نام لکھے

اسلامیہ کالج (موجودہ یونیورسٹی) پشاور۔ قائداعظم کی وصیت سے خاندانی حصص کے بعد ایک تہائی کی حقدار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (سرسید کے خواب کی تعبیر) قائداعظم کی وصیت سے خاندانی حصص کے بعد ایک تہائی کی حقدار

قائداعظم کی مادرِ علمی، سندھ مدرسۃ الاسلام (موجودہ یونیورسٹی) ان کی وصیت سے ایک تہائی کی حقدار

قائداعظم کا مقامِ ولادت، وزیر مینشن، کھارادر (کراچی)
یہ مکان ایک زمانے میں ان کے والد جناح پونجا کی ملکیت تھا۔ بائیں جانب علی منزل دکھائی دے رہی ہے

قائداعظم کا مقامِ رحلت اور پاکستان کا سابقہ ایوان صدر کراچی
آج کل یہ سندھ کا گورنر ہاؤس ہے جہاں قائداعظم کا انتقال ہوا

قائداعظم کا مکان علالت، زیارت ریزیڈینسی (موجودہ قائداعظم ریزیڈینسی) ضلع زیارت، بلوچستان
جہاں قائداعظم نے زندگی کے آخری 64 ایام گزارے۔ برف باری کا حسین منظر

موہاٹا پیلس (محل) موجودہ قصرِ فاطمہ جناح میوزیم، کراچی۔ قائد کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح اور ان کے انتقال
کے بعد ایک اور ہمشیرہ محترمہ شیریں جناح یہاں اپنے انتقال تک رہائش پذیر رہیں

ہوئے صنوبر کے سرسبز جنگل میں گھرا ہوا ہے، جو اپنی نوعیت کا دنیا میں دوسرا سب سے بڑا جنگل ہے۔ اس کے کچھ درختوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سات ہزار سال پرانے ہیں۔ سردیوں میں شدید برف باری کی کشش ملک بھر کے سیاحوں کو زیارت کھینچ لاتی ہے۔ مذکورہ تاریخی ریذیڈنسی زیارت شہر کے بلند ترین مقام پر واقع ہے جس کی اونچائی سطح سمندر سے 2,700 میٹر (یعنی 8,850 فٹ) ہے۔ بہ الفاظ دیگر ریزیڈنسی شہر کی عمومی سطح سے 500 فٹ اوپر ہے جہاں سے گردوپیش کا نظارہ بہت خوب ہوتا ہے۔ اس عمارت کی تصویر پاکستان کے سو روپے کے کرنسی نوٹ کی پچھلی طرف بنی ہوئی ہے۔

ذاتی معالجوں بشمول ڈاکٹر الٰہی بخش اور ڈاکٹر علی مستری کے تجویز کرنے پر قائداعظم وسط جون 1948ء میں کوئٹہ آ گئے۔ اس کے بعد سرکاری مصروفیات کی وجہ سے کراچی واپس جانا پڑا۔ بوجہ صحت ایک مرتبہ پھر 6 جولائی 1948ء کو کوئٹہ تشریف لائے۔ انتظامیہ نے قائد کے لیے زیارت میں ریذیڈنسی کو تیار کر دیا جہاں اُن کے ساتھ اُن کی ہمشیرہ فاطمہ جناح اور کوئٹہ سے تعلق رکھنے والی ایک کھولک نرس ایس اے ناتھانیل (وفات 2013ء) نے اُن کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ زیارت ریذیڈنسی میں آپ کا قیام لگ بھگ 65 دن کا رہا۔ اوائل ستمبر 1948ء کو نمونیا کے شدید دورے کی وجہ سے قائدِاعظم کو بہتر علاج کے لیے واپس کراچی لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا جہاں پہنچنے کے چند گھنٹوں میں آپ نے اپنی جاں جان آفرین کے سپرد کر دی۔

قیامِ پاکستان کے پہلے چند ایک عشروں تک کسی حکومت نے زیارت ریذیڈنسی کو قومی ورثے کے طور پر محفوظ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اسے کوئٹہ میں تعینات سینئر سرکاری افسران کی تفریح کے لیے گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ نہ صرف ریذیڈنسی میں چھٹی وغیرہ کے روز آ کر ٹھہرتے بلکہ بسا اوقات جناح صاحب کے کمرے اور اس میں موجود فرنیچر کو بھی استعمال کرتے۔ 1970ء کی دہائی میں جب ریذیڈنسی کی ساگوان کی لکڑی پر سرخ اور سفید پینٹ کیا گیا تو اس کی اصل شکل وصورت تبدیل ہو گئی۔ ایک تاریخی عمارت کو یوں تبدیل کرنا اخلاقی اور قانونی دونوں لحاظ سے غیر مناسب تھا۔

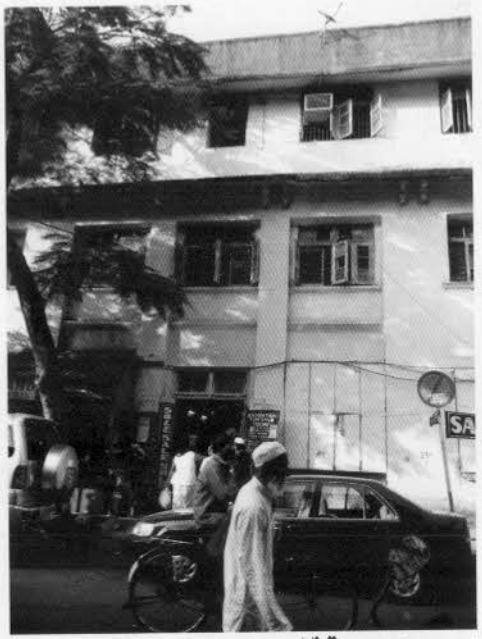

بمبئی میں پیپلز جناح ہال اور اس کے اوپر واقع فلیٹس۔ یہ عمارت، شہریانِ بمبئی نے ایک روپیہ فنڈ کے ذریعے 65 ہزار روپے جمع کر کے قائداعظم اور بیگم جناح کی بہادری کے اعتراف میں ان کے نام یادگار کے طور پر تعمیر کی تھی

مزارِ قائد کراچی غروبِ آفتاب کے وقت کا دلکش منظر

آخرکار، یہ 1980ء کی دہائی کے ابتدائی سال تھے جب حکومت نے ریذیڈنسی کو قومی یادگار کا درجہ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے اسے ایک عجائب گھر میں تبدیل کردیا۔ قائدِاعظم کے احترام میں زیارت شہر اور ملحقہ علاقے کو 1986ء میں الگ ضلع کا درجہ دے دیا تھا جس کی دو تحصیلیں، زیارت اور سنجاوی ہیں۔ 1990ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں اچانک لگنے والی آگ نے ریزیڈنسی کو بری طرح نقصان پہنچایا۔ بہرحال جہاں تک ممکن ہوسکتا تھا، ماہرین کے ذریعے اسے اصل کے مطابق بحال کردیا گیا۔

وسط 2013ء میں دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار دہشت گردوں نے اغیار کی پشت پناہی سے آدھی رات کے وقت ریذیڈنسی پر دستی بموں سے حملہ کیا اور اس میں چھے ٹائم بم نصب کردیے۔ ڈیوٹی پر موجود اکلوتے پولیس اہلکار نے تن تنہا بزدل دہشت گردوں کا جواں مردی سے مقابلہ کیا اور اُنہیں چھے بم پھاڑے بغیر فرار ہوجانے پر مجبور کردیا۔ اس نے جامِ شہادت نوش کرنے سے پہلے بم ڈسپوزل اسکواڈ کو اطلاع کردی جس نے آکر چھے کے چھے بموں کو ناکارہ بنادیا۔ تاہم دستی بموں سے لگنے والی آگ نے عمارت کے لکڑی کے حصے کو تباہ کردیا۔

اس اندوہناک سانحے پر ابتدائی طور پر ماہرین تعمیرات و بحالی پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں کامل خان ممتاز اور یاسمین لاڑی شامل تھے اور اس منصوبے کی قیادت مشہور ماہرِ تعمیرات نیّر علی دادا کررہے تھے۔ کمیٹی نے ایک مقامی ماہرِ تعمیرات نصیر احمد حجازی کو بھی اپنی ٹیم میں شامل کرلیا۔ اُنھوں نے پرانی تصاویر اور 1990ء کی دہائی کی بحالی کی دستاویزات کی مدد سے ایک مرتبہ پھر ریذیڈنسی تعمیر کردی جس پر 140 ملین روپے لاگت آئی۔ یومِ آزادی، 14 اگست 2014ء کو ایک پُروقار تقریب میں وزیراعظم پاکستان نواز شریف نے نوتعمیر شدہ ریذیڈنسی کا افتتاح کیا اور اس کو عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ اس مرتبہ قائداعظم ریذیڈنسی میں تحریکِ آزادی کا عجائب گھر قائم کیا گیا جسے دیکھنے کے لیے 2014ء سے آج تک ہر سال لاکھوں افراد آتے ہیں۔

آنے والے وقت میں وہ چاروں دہشت گرد اور اُن کے ماسٹر مائنڈ قانون نافذ

کرنے والے اداروں کے آپریشن میں اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچے۔ اس واقعے سے پہلے ریذیڈنسی میں سکیورٹی نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ اب فرنٹیئر کور اور بلوچستان پولیس کے پچاس سے ساٹھ اہل کار چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت کرتے ہیں تاکہ کوئی دشمن کبھی دوبارہ اس عظیم عمارت کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔

ضمیمہ ج

پرانا ایوانِ صدر، کراچی

(مکانِ رحلت)

صوبہ سندھ کا موجودہ گورنر ہاؤس پاکستان کا پہلا ایوانِ صدر تھا جو اُس وقت کے دارالحکومت کراچی میں واقع ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے بمبئی سے آنے کے بعد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر اس میں 7 اگست 1947ء سے رہائش اختیار کی۔ آپ نے 6 جولائی 1948ء تک یہیں قیام فرمایا تاوقتیکہ بگڑتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر معالجوں نے آپ کو کسی خنک اور سرسبز مقام پر منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے زیارت کا انتخاب کیا (جس کا ذکر ضمیمہ ب میں آچکا ہے) جہاں قائد نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری 65 دن بسر کیے۔ 11 ستمبر 1948ء کی سہ پہر اُنہیں واپس کراچی گورنر جنرل ہاؤس (ایوانِ صدر) لایا گیا جہاں اُسی رات کو آپ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کا خاندان (ہمشیرہ فاطمہ جناح) پہلے جناح منزل کراچی (دیکھیے باب نمبر 4) اور پھر موہاٹا محل (دیکھئے اگلا ضمیمہ د) میں منتقل ہو گیا۔

قائد کے جانشین گورنر جنرلوں کے علاوہ پاکستان کے پہلے دو صدور اسکندر مرزا اور ایوب خان نے بھی اسی مکان کو اپنی سرکاری رہائش گاہ بنایا۔ 1956ء میں اس وسیع وعریض محل کا سرکاری نام گورنر جنرل ہاؤس سے تبدیل کر کے باضابطہ طور پر ''ایوانِ صدر''

رکھ دیا گیا۔ 1970ء میں ون یونٹ کے خاتمے پر اس عمارت کو گورنر ہاؤس سندھ کا درجہ دوبارہ ملا جو کہ برطانوی دور میں اسے حاصل تھا۔ یہاں ہر صبح گارڈز کا دستہ بگل کی دھن پر قومی پرچم لہراتا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ جس سڑک پر یہ گورنر ہاؤس واقع ہے وہ آج بھی کراچی کی ایوان صدر روڈ کہلاتی ہے۔

یہ محل گورنمنٹ ہاؤس کراچی کے اصل مقام پر کھڑا ہے جسے سر چارلس نیپئر نے 1843ء میں تعمیر کیا تھا جب انگریزوں نے سندھ کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔ چارلس نیپئر نے تو اسے اپنی ذاتی رہائش گاہ کے طور پر بنوایا تھا لیکن جب وہ 1847ء میں کراچی سے چلے گئے تو حکومتِ ہند نے یہ عمارت اُن سے خرید لی۔ تب سے اسے سندھ کے کمشنر کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ چنانچہ اگلی ایک صدی یہ عمارت گورنمنٹ ہاؤس کے طور پر جانی جاتی رہی۔

دستورِ حکومتِ ہند 1935ء المعروف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ واضح رہے کہ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنانے کا مطالبہ 1929ء کے قائدِ اعظم کے 14 نکات کا اہم ستون تھا۔ سندھ کے پہلے انگریز گورنر سر لنسیلوٹ گراہم نے ایک نئے گھر کی ضرورت محسوس کی کیوں کہ پرانے گورنمنٹ ہاؤس کی حالت بہت خستہ ہو چکی تھی اور وہ رہائش کے لیے محفوظ نہیں تھا۔ چنانچہ نیپئر والے گورنمنٹ ہاؤس کو مسمار کر کے اسی احاطے میں نئے گورنر ہاؤس کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ اُنھوں نے اس کا سنگِ بنیاد 2 نومبر 1936ء کو رکھا۔ گورنر گراہم نے نقش ونگار والے پتھروں اور آر سی سی کے ستونوں اور سلوں سے تعمیر کی جانے والی اس شاندار دومنزلہ عمارت کے ڈیزائن میں ذاتی دلچسپی لی۔ اپنے وقت کے عظیم ماہر تعمیرات آر ٹی رسل اور حکومتِ ہند کے ایک سرکاری کنسلٹینٹ سے عمارت کا نقشہ بنوایا جن کی نگرانی میں کراچی کے مقامی علاقے گزری میں تیار شدہ پتھر بنیادوں اور دیواروں کے لیے استعمال کیا گیا اور دھلپور پتھر بروہی سے منگوایا گیا۔

بتیس ایکڑ وسیع وعریض زمین پر یو (U) شکل میں یہ نیا عظیم الشان محل سات لاکھ روپے لاگت سے اڑھائی سال میں تیار ہوا۔ عمارت کے اطراف کو بلند درختوں اور سرسبز

لان سے مزین کیا گیا۔ 1939ء کے آغاز میں ایک شان دار افتتاحی تقریب کے بعد سر لنسیلوٹ گراہم نے اس عمارت میں رہائش اختیار کر لی۔ سندھ کے تینوں انگریز گورنر صاحبان بشمول سر لنسیلوٹ گراہم، سر ہیوڈاؤ اور سر فرانسس موڈی اسی عالیشان عمارت سے سندھ پر حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ آزادی سے چند روز قبل تین اگست 1947ء کو پاکستان کی عبوری حکومت نے اس محل کو اپنے سربراہِ مملکت کی سرکاری رہائش گاہ قرار دے دیا۔ چار دن بعد یعنی سات اگست کو بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی یہاں جلوہ افروز ہوئے اور محل کے پہلے مسلمان اور پہلے پاکستانی مقیم بن گئے۔

غرضیکہ موجودہ گورنر ہاؤس کا نام کئی مرتبہ تبدیل ہوا۔ اس میں رہائش اختیار کرنے والے عہدے دار کے لحاظ سے ایسا کرنا ضروری تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، اس عمارت کا نام شروع میں نیپئر ہاؤس تھا۔ اس کے بعد یہ محل کمشنر ہاؤس، اور پھر گورنمنٹ ہاؤس کہلایا۔ قائدِاعظم کے قیام کے دوران اسے گورنر جنرل ہاؤس کہا جانے لگا۔ 26 مارچ 1956ء تک اس کا نام گورنر جنرل ہاؤس ہی رہا یہاں تک کہ مشہور سی ایس پی افسر اسکندر مرزا اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے منتخب شدہ صدر بن گئے جس کے ساتھ ہی یہ عمارت ایوانِ صدر کے نام سے موسوم ہوئی۔ جولائی 1970ء میں صدر یحییٰ خان کے فیصلہ پر ون یونٹ کا خاتمہ ہونے سے صوبوں کی حیثیت بحال ہوگئی تو اس عمارت کا نام گورنر ہاؤس سندھ ہوگیا۔ واضح رہے کہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی 13 برسوں میں جب تک کراچی ملک کا مرکزی دارالحکومت رہا، سندھ کا صوبائی دارالحکومت حیدرآباد ہوتا تھا جہاں صوبے کے گورنر اور وزیرِاعلیٰ صاحبان رہائش رکھتے تھے۔

اس عمارت کے تین حصے ہیں۔ جس سویٹ میں قائدِاعظم اور محترمہ فاطمہ جناح قیام پذیر رہے وہ رائل سویٹ کہلاتا ہے اور جو صرف دورے پر آئے سربراہانِ مملکت، سرکاری یا دیگر اہم شخصیات کے قیام کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ دربار ہال کی تصاویر اکثر قومی اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا میں دکھائی دیتی ہیں کیوں کہ اس ہال میں سندھ کے تمام گورنر صاحبان، وزرائے اعلیٰ اور چیف جسٹس وغیرہ کی حلف برداری کی تقاریب منعقد

ہوتی ہیں۔ دربار ہال میں ایک تاریخی تخت ہے جو شاہ ایڈورڈ ہفتم کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا گیا تھا جب اُنھوں نے 1876ء میں بطور پرنس آف ویلز یعنی ولی عہد ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اسی تخت کو ملکہ میری نے بھی استعمال کیا جب 1911ء میں بادشاہ جارج پنجم کی دہلی میں تاج پوشی کی۔ انگریز دور میں دربار ہال بنیادی طور پر ایک رقص گاہ تھا جہاں انگریز افسران اور اشرافیہ کے لیے سرگرمیوں کا انعقاد ہوتا تھا مگر آج دربار ہال کے داخلی دروازے پر سعودی عرب کے بادشاہ شاہ فیصل مرحوم کا عطیہ کردہ غلافِ کعبہ کا ایک ٹکڑا آویزاں ہے۔ مزید براں اس ہال میں پاکستان کے ان تمام صدور اور گورنر جنرلوں کی قدآدم تصاویر ہیں جو یہاں رہائش پذیر رہے ہیں اور اُن تمام افراد کی بھی جنھوں نے ون یونٹ قائم ہونے سے پہلے یا پھر صوبائی دارالحکومت حیدرآباد سے کراچی منتقل ہونے کے بعد بطور گورنر سندھ فرائض سرانجام دیے۔

قائدِاعظم پاکستان کی معیشت کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کی معیشت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔ جب قائد کی زندگی کے آخری ایام میں مہلک بیماری تپ دق آخری سٹیج پر تھی تو اُس وقت کی مروجہ طبی سوچ یہی تھی کہ تپ دق خراب آب وہوا کی وجہ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ پہاڑی مقامات پر اس بیماری کے علاج کے شفاخانے بنائے گئے تھے۔ قائدِاعظم کو زیارت جانے کا مشورہ دیا گیا جہاں انگریز دور کی ایک ریذیڈنسی موجود تھی جسے عارضی طور پر گورنر جنرل کی رہائش گاہ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ قائداعظم نے زیارت کا سفر موقوف کیے رکھا اور جون 1948ء میں چند ہی دن کوئٹہ رہ کر کراچی لوٹ آئے کیوں کہ آپ ریاست کے مالیاتی نظام کی بنیاد کے لیے اسٹیٹ آف پاکستان کا افتتاح کرنا چاہتے تھے جو آپ نے یکم جولائی 1947ء کو سرانجام دیا۔

اس دوران نوجوان فوجی افسر کیپٹن صاحبزادہ یعقوب خان جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل یعقوب خان اور بہت بعد میں پاکستان کے وزیرِخارجہ بنے، گورنر جنرل کی حفاظت کے لیے ایک گھڑسوار دستہ ترتیب دینے میں مصروف تھے۔ اسٹیٹ بینک کی افتتاحی تقریب وہ پہلا موقع تھا جب قائدِاعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کو گورنر جنرل کے سرخ وردی میں ملبوس گھڑسوار

محافظ دستے کے جلو میں ریاستی اعزاز کے ساتھ کسی سرکاری تقریب میں لایا گیا تھا۔ اڑھائی ماہ بعد اسی گھڑسوار محافظ دستے کے جلو میں آپ کے جسد خاکی کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ نمائش گراؤنڈ میں آپ کی نمازِ جنازہ کے مقام پر لایا گیا۔ آج یہ دستہ صدر کا محافظ دستہ (پریذیڈنٹ باڈی گارڈ) کہلاتا ہے اور تمام تقریبات میں صدرِ پاکستان کی حفاظت کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ بہرحال قائد کو 6 جولائی کو بذریعہ ہوائی جہاز کوئٹہ اور پھر اُسی سہ پہر وہاں سے بذریعہ کار زیارت لے جایا گیا۔

اگلے دو ماہ تک قائد کی صحت میں بہتری کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے بلکہ الٹا آپ کو نمونیا ہو گیا تو آپ کے معالجوں نے آپ کو واپس کراچی لے جانے کا مشورہ دیا جہاں بہتر طبی سہولیات میسر تھیں۔ قائد اس مرض کے ساتھ واپس گورنر جنرل ہاؤس جانے پر متذبذب تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ گورنر جنرل ہاؤس میں اپنے سونے کے کمرے تک جانے کے لیے اُنہیں اپنے دونوں اے ڈی سی صاحبان کے کمروں کے سامنے برآمدے میں سے گزرنا ہوتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ کہ اُن کے افسران اُنہیں سٹریچر پر لیٹے ہوئے اپنے کمرے میں لے جایا جاتا دیکھیں۔ واضح رہے کہ قائد کے ملٹری سیکرٹری کرنل نولز (Col. Noles) اور نیوی (پاک بحریہ) کے اے ڈی سی لیفٹیننٹ مظہر بیشتر عرصہ زیارت میں ہی آپ کی خدمت پر معمور رہے تاہم باقی دونوں افسران یعنی فوجی اے ڈی سی میجر گل حسن (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کے طور پر پاک فوج کے کمانڈر انچیف بنے) اور پاک فضائیہ کے اے ڈی سی فلائٹ لیفٹیننٹ میاں عطا ربانی (سابق چیئرمین سینٹ رضا ربانی کے والد) کے دفاتر وہیں گورنر جنرل ہاؤس، کراچی، میں تھے۔ قائدِاعظم اپنے قدموں پر چل کر اس غلام گردش سے گزرنا چاہتے تھے۔ افسوس، ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ آپ کی صحت بگڑ چکی تھی، وزن محض 70 پونڈ، یعنی 32 کلو رہ گیا تھا اور نقاہت کی وجہ سے کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ نو ستمبر 1948ء کو محترمہ فاطمہ جناح نے گورنر جنرل کو واپس کراچی لے جانے کا طبی مشورہ قبول کر لیا۔ دس ستمبر کو آپ کو کوئٹہ لایا گیا۔ اگلے روز دوپہر تین بجے کے لگ بھگ قائد کا ڈکوٹا طیارہ کراچی کے ماڑی پور ہوائی اڈے پر اترا۔ بابائے قوم کو گورنر جنرل ہاؤس تک لے جایا جا رہا تھا کہ راستے میں ایمبولینس

خراب ہو گئی۔ دوسری ایمبولینس کا انتظام ہونے تک قائد کو اپنی خراب صحت کے ساتھ ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ وقت موسم کی تمازت برداشت کرنی پڑی۔

جب محمد علی جناح گورنر ہاؤس پہنچے تو اُن کے چاروں معالجین اُن کے منتظر تھے جن میں لاہور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل الٰہی بخش، رائل نیوی کے سرجن کمانڈر محمد علی مستری، تپ دق کے مشہور ڈاکٹر ریاض علی شاہ اور کراچی کے ممتاز پتھیالوجسٹ ڈاکٹر غلام محمد شامل تھے۔ اُنھوں نے قائد کی جان بچانے کی پوری کوشش کی لیکن ہر گزرتے لمحے اُن کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر اُنہیں تسلی دے رہے تھے لیکن قائداعظم کے یہ آخری الفاظ اُن کے منہ سے نکلے، ''نہیں، اب میں نہیں بچ سکتا''، اور اُنھوں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔ دس بج کر پچیس منٹ پر قائدِاعظم محمد علی جناح اسی محل میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ 12 ستمبر علی الصبح تین بجے آپ کی رحلت کی خبر ریڈیو پاکستان سے سرکاری طور پر نشر کی گئی۔ 12 ستمبر ہی کی سہ پہر آپ کے جسدِ خاکی کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ جمشید کوارٹر کے نزدیک سپردِ خاک کیا گیا جہاں آج قائدِاعظم کا مزار قائم ہے (دیکھئے ضمیمہ ر)۔

گورنر ہاؤس سندھ کا دربار ہال ہماری تاریخ کا حصہ ہے کیوں کہ اس کے درودیوار نے قائدِاعظم محمد علی جناح کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر حلف اُٹھاتے دیکھا تھا۔ ہر گورنر سندھ کو یہ اعزاز حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اُس مکان میں رہائش پذیر ہوتے ہیں جہاں کبھی بابائے قوم رہا کرتے تھے۔

آخر میں یہاں سے ایک میل سے بھی کم فاصلے پر ایک اور تاریخی عمارت کا ذکر قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو آج کل سٹیٹ گیسٹ ہاؤس کہلاتا ہے۔ برطانوی وزیراعظم کی 10-ڈاؤننگ سٹریٹ کے پتہ کی طرح یہ عمارت 10-وکٹوریہ روڈ کہلاتی اور لیاقت علی خان سے لے کر ساتویں وزیراعظم ملک فیروز خان نون تک پاکستان کا وزیراعظم ہاؤس ہوا کرتی تھی۔ آج کل یہ 10-عبداللہ ہارون روڈ کراچی کہلاتی ہے۔ سابق صدر ممنون حسین کے صدر بننے کے بعد ان کے اہل خانہ یہاں منتقل ہو گئے تھے۔ اب یہ دوبارہ سٹیٹ گیسٹ ہاؤس ہے۔

ضمیمہ د

قصرِ فاطمہ (پرانا موہاٹا محل)

(مکان وراثت)

کراچی کی حاتم علوی روڈ پر واقع موہاٹا محل (Mohatta Palace) اُس وقت قصرِ فاطمہ (فاطمہ کا محل) بن گیا جب قائدِاعظم محمد علی جناح کی بہن فاطمہ جناح نے اس محل میں رہائش اختیار کی۔ بابائے قوم کی رحلت کے بعد اُن کی ہمشیرہ اور سیاسی وارث محترمہ فاطمہ جناح نے بھی کراچی میں ہی رہنا پسند کیا۔ ابتدائی طور پر وہ جناح منزل (پرانا فلیگ سٹاف ہاؤس) منتقل ہوگئیں جو اُن کے بھائی کی ذاتی ملکیت تھی (دیکھیے باب 4)۔ تاہم کئی دہائیوں کی کوشش کے باوجود بھارتی حکومت ساؤتھ کورٹ اُن کے حوالے نہ کرنے کی ہٹ دھرمی پر قائم رہی تو حکومتِ پاکستان نے محترمہ فاطمہ جناح کو ساؤتھ کورٹ کے بدلے متروکہ جائیداد دینے کا فیصلہ کیا (دیکھئے باب 2 اور 12)۔ اس پر اُنہیں موہاٹا محل الاٹ کر دیا گیا جس میں اُنھوں نے زندگی کے باقی دن پورے کیے۔ 1967ء میں فاطمہ جناح کا انتقال اسی محل میں ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا، قائدِاعظم کی ایک اور ہمشیرہ شیریں بائی جناح 1968ء میں بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آگئیں جب اُن کے شوہر اور اکلوتے بیٹے کا وہاں انتقال ہوگیا۔ شیریں جناح کو بھی یہی محل الاٹ کر دیا گیا جہاں وہ 1980ء میں اپنے انتقال تک قیام پذیر رہیں۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ فاطمہ جناح کے انتقال کے ساتھ ہی قائدِاعظم کے دونوں تایا والجی پونجا اور نتھو پونجا کے نواسوں نے موہاٹا محل سمیت فاطمہ جناح کی تمام جائیداد پر عدالتی دعوے دائر کر دیے اور شیریں جناح سے یہ محل ہتھیانے کی بہت کوشش کی اور عدالت میں اُن پر موہاٹا محل پر ناجائز قبضہ کے الزامات لگائے لیکن آخر میں سبکی کا سامنا ہی اُن کا نصیب بنا۔

موہاٹا محل 1927ء میں ساحلِ سمند کے قریب کلفٹن کے مہنگے علاقے میں راجستھان سے تعلق رکھنے والے ہندو مارواڑی سیٹھ شیورتن چندررتن موہاٹا نے تعمیر کرایا تھا۔ واضح رہے کہ بھارتی صوبہ راجستھان برطانوی دور میں 19 خودمختار شاہی ریاستوں پر مشتمل تھا، مثلاً جے پور، جودھ پور، بیکانر وغیرہ۔ فیصلے کے پیچھے کہانی بتائی جاتی ہے کہ اُس کی اہلیہ شدید علیل تھی۔ معالجوں نے سیٹھ موہاٹا کو بتایا کہ سمندر کی طرف سے آنے والے فرحت بخش ہوا سے اہلیہ کی بیماری میں افاقہ ہوگا۔ اُس نے طے کیا کہ اپنی رفیقہ حیات کے لیے راجستھانی مہاراجوں کی طرز کا محل بنا دے گا۔ اس طرح موہاٹا محل کی پیار کہانی بھی تاج محل جیسی ہے۔ فرق یہ ہے کہ شاہ جہاں نے تاج محل اپنی ملکہ کی وفات کے بعد اُس کی محبت بھری یاد میں تعمیر کرایا تھا جبکہ سیٹھ موہاٹا نے یہ محل اپنی قریب المرگ زوجہ کی صحت یابی کی خاطر انتہائی پیار سے بنوایا تھا۔ بیگم موہاٹا تو جانبر نہ ہوسکیں لیکن تعمیر کیا گیا محل شیورتن موہاٹا کے لیے پہلے تو موسمِ گرما گزارنے کا مقام اور بعد میں مستقل رہائش گاہ بن گیا۔ موہاٹا نے اس محل میں قیامِ پاکستان تک، گویا بیس سال رہائش رکھی۔ (2)

سیٹھ شیورتن موہاٹا کا تعلق مارواڑی برادری سے تھا۔ اس کا دادا موتی لال موہاٹا 1842ء میں راجستھان کی ریاست بیکانر سے ہجرت کر کے حیدرآباد (دکن) چلا گیا اور ایک دوکان پر منشی کے طور پر کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ امیر تاجر بن گیا۔ اُس کے چاروں بیٹے نقل مکانی کر کے کلکتہ جا بسے اور غیر ملکی کپڑے کے نامی گرامی تاجر بن گئے۔ اُن چاروں میں سے ایک گوواردھن داس موہاٹا نامعلوم وجوہات کی بنا پر اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر 1883ء میں کراچی چلا آیا جہاں اُس نے اپنا کاروبار قائم کیا۔ گوواردھن داس موہاٹا کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا رام گوپال نہ صرف ایک کامیاب کاروباری شخص بلکہ ایک دانشور اور مصنف بھی تھا۔ وہ

کراچی ہندو جمخانہ کے بانیوں میں سے ہے۔ 1925ء میں مکمل ہونے والا یہ جمخانہ آج بھی قائم ہے اور اس کا مرکزی ہال رام گوپال موہاٹا کے نام سے منسوب ہے۔

رام گوپال کا چھوٹا بھائی شیورتن موہاٹا پہلے واپس آبائی ریاست راجستھان چلا گیا لیکن پھر دوبارہ کراچی واپس آ کر فولاد اور چینی کے کارخانے لگائے اور پام اولیو (Palm Olive) صابن متعارف کرایا۔ یہ نوجوان سیٹھ ایک کامیاب صنعت کار بنا جس نے جہاز رانی اور تجارت میں بھی قسمت آزمائی۔ چوں کہ محمد علی جناح کا تعلق بھی کراچی کے ایک کاروباری خاندان سے تھا، اس لیے دونوں کی ایک اتفاقیہ ملاقات پوری زندگی کی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ جناح صاحب کا یہ دوست 1927ء میں اس مسحور کن بنگلے کا خالق اور پہلا مالک بن گیا جس میں 40 سال بعد قائداعظم کی اپنی ہمشیرہ فاطمہ جناح کا جینا اور مرنا لکھا تھا۔ وقت بھی کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔

شیورتن موہاٹا نے عالیشان محل کے لیے جس ماہر تعمیرات کی خدمات حاصل کیں، وہ احمد حسین آغا تھے۔ احمد حسین آغا کا شمار جدید برصغیر کے معروف مسلمان ماہرین تعمیرات میں ہوتا ہے۔ وہ صوبہ راجستھان کی ایک اور ریاست جے پور سے تعلق رکھتے تھے جہاں سے وہ میونسپل سروسز کی نگرانی کے لیے کراچی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ احمد حسین آغا نے کراچی کی کئی ایک عمارتوں کے نقشے بنائے تھے جیسے کراچی ایوانِ صنعت و تجارت اور ہندو جمخانہ وغیرہ لیکن موہاٹا محل اُن کی پیشہ ورانہ زندگی کا شاہکار ثابت ہوا۔ آغا نے مقامی سنگ تراشی کے ہنر اور راجپوت شہزادوں کے محلات، انگریز دور میں تعمیر شدہ ایوانوں کے ڈیزائن کو باہم مدغم کر کے اس محل کا ڈیزائن تخلیق کیا۔

احمد حسین آغا نے 18,500 مربع فٹ (1,720 مربع میٹر) پر محیط اس تعمیر کا انداز راجستھان کے محلات کی مماثلت میں تصور کیا۔ واضح رہے کہ آغا اور موہاٹا یعنی مشیر اور مالک، دونوں کا تعلق راجستھان سے تھا۔ آغا نے ریاست جودھ پور کا گلابی پتھر اور گزری کا مقامی زرد پتھر استعمال کیا۔ رنگوں کے امتزاج اور ساحل سمندر کے شاندار پس منظر نے محل کو ایک منفرد شان بخشی جس میں ہندو عرب (Indo-Saracen) تعمیر کی جھلک ملتی ہے۔ محل کا

سامنے کا حصہ رنگین کھڑکیوں، پتھر کی محرابوں اور تکونی ستونوں سے سجا ہے جبکہ خوبصورت نمونوں کے جنگلے عمارت کی شکل کو مسحور کن بناتے ہیں۔ محل پر نو گنبد ہیں جن کے درمیان میں مرکزی گنبد ہے جب کہ سامنے والے حصے کی نیلی کھڑکیاں ایک باغ میں کھلتی ہیں۔ محل کے پچھلے حصے کی کھڑکیوں میں دھندلے شیشے لگے ہوئے ہیں۔ محل کی زمینی منزل کے کمرے شاہانہ اور پر کیف ہیں، جبکہ بالائی منزل پر نجی سہولیات ہیں۔ راہداری پر سائے کے لیے ساگوان کی لکڑی کا پردہ ہے جو شدید دھوپ سے بچاتا ہے۔ اس محل کے طویل برآمدہ میں خوبصورت دروازوں کی قطار جاذب نظر ہے۔

عمارت کے اندر قدم رکھتے ہی انسان خود کو راہداری میں پاتا ہے جو زمینی منزل پر موجود ہر کمرے کو دوسروں سے ملاتی ہے۔ یہ وسیع و عریض راہداری ایک بہت بڑے گول ہال کے گرد گھومتی ہے جس کی چھت منقش اور جنوبی سمت زینہ ہے۔ محل کے ہر کونے پر ہشت پہلو مینار ہیں جن میں گھومتی ہوئی سیڑھیاں چھت تک جاتی ہیں۔ موہاٹا محل کی برساتی میں ایک خوبصورت مندر ہے جو ہندو دیوتا شیوا سے منسوب ہے۔ یہاں بیگم موہاٹا دورانِ علالت بھی پوجا کے لیے جاتی تھی۔ مشہور یہ ہے کہ موہاٹا محل سے ایک سرنگ ایک کلومیٹر دور ساحل سمندر پر واقع شری مہادیو مندر تک جاتی تھی لیکن یہ سرنگ اب موجود نہیں۔ کلفٹن ساحل کا خوبصورت گنبد شہر کراچی کی علامت یعنی Icon ہے۔ اس کے ساتھ تہ خانے میں موجود یہ مندر ہندو برادری کے نزدیک بہت مقدس ہے لیکن زیرِ زمین ہونے کی وجہ سے کلفٹن روڈ سے دکھائی نہیں دیتا۔

1947ء میں تقسیم کے وقت سیٹھ شیورتن موہاٹا نے قائدِاعظم سے طویل دوستی ہونے کی وجہ سے پاکستان ہی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ وہ پہلے ہی گزشتہ بیس برس سے اس محل میں رہ رہا تھا جہاں اُس کی آنجہانی اہلیہ کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ شیورتن موہاٹا کو کراچی سے بھی اُنسیت تھی جہاں اُس نے دولت کمائی تھی۔ جب تک قائدِاعظم پاکستان کے حکمران رہے، موہاٹا کو کوئی مسئلہ نہیں ہوا لیکن بانیٔ پاکستان آزادی کے ایک سال بعد ہی جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ 1948ء کی ایک صبح اُس وقت اُن

کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی جب پاکستانی سیاست کی ایک طاقتور شخصیت نے اُنہیں فون کیا کہ وہ سرکاری استعمال کے لیے موہاٹا محل کو فوراً خالی کر دے۔ چنانچہ خوفزدہ ہو کر اُس نے راتوں رات پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز اس نے سامان باندھا اور اپنے خاندان کو لے کر بمبئی چلا گیا۔ جاتے وقت موہاٹا نے محل کی چابیاں اپنے منیجر کے حوالے کر دی تھیں اور کہا کہ یہ فلاں سیاست دان کو دے دے اور بتا دے کہ خالی کرنے کے حکم کی بجائے اگر وہ درخواست بھی کرتا تو وہ یہ محل بخوشی حکومتِ پاکستان کے حوالے کر سکتا تھا۔ غمزدہ سیٹھ موہاٹا یا اُس کے خاندان میں سے کوئی فرد دوبارہ کبھی کراچی یا پاکستان کے کسی اور شہر میں نہ آیا۔(3) البتہ احمد حسین آغا کا خاندان آج بھی کراچی میں آباد ہے۔

یہ محل حکومتِ پاکستان نے نئی قائم شدہ وزارتِ خارجہ کے لیے حاصل کیا تھا۔ تقسیم کے دنوں کے ڈپٹی پروٹوکول آفیسر آغا ہلالی اس عمارت کے وزارتِ خارجہ کے دفتر کے لیے استعمال پر لکھتے ہیں: ''موہاٹا محل شہر سے کافی فاصلے پر واقع تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے ملازمین کو سفر کی دقت اُٹھانا پڑتی تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہم نے ایمپرس مارکیٹ سے موہاٹا محل کے لیے ایک بس چلائی۔ اُس وقت کلفٹن گنجان آباد علاقہ نہیں تھا؛ وہاں صرف سمندر کا پانی اور ریت تھی۔ بعض اوقات اس علاقے میں سمندر کا پانی چڑھ جاتا اور سڑک چھے انچ گہرے پانی میں ڈوب جاتی تھی۔'' وزارتِ خارجہ اس محل کی تصاویر اپنے موسمی اور نئے سال کے کارڈز پر سرکاری طور پر استعمال کرتی تھی۔ جب پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے تبدیل ہوا تو دفتر خارجہ 1964ء میں اسلام آباد چلا گیا۔ اُسی سال یہ محل محترمہ فاطمہ جناح کو بمبئی کے جناح ہاؤس کے بدلے متروکہ جائیداد کے طور پر الاٹ کر دیا گیا۔

جب یہ محل محترمہ فاطمہ جناح کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو وزارتِ خارجہ نے اسے فوراً خالی کرنے کی پیشکش کی لیکن محترمہ نے اس میں دلچسپی ظاہر نہ کی۔ بہرحال وزارتِ خارجہ نے یہ عمارت مکمل طور پر صاف کر کے اس کے اردگرد لگی سکیورٹی کی خاردار تار ہٹا دی۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے کبوتروں کے گھونسلے بھی صاف کروا دیے تاکہ محترمہ فاطمہ جناح کو کوئی دقت نہ ہو۔ بالآخر فاطمہ جناح کو اسے کم از کم ایک نظر دیکھنے کے لیے راضی کر لیا گیا۔ جب

اُنھوں نے موہاٹا محل کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس عمارت نے اُن کے دل میں گھر کر لیا۔

روزنامہ ڈان کو انٹرویو دیتے ہوئے فاطمہ جناح کی سہیلی بیگم شائستہ اکرام اللہ اس محل سے جڑی یادیں بیان کرتی ہیں: ''ایک صبح فاطمہ جناح مجھے موہاٹا محل کی چھت پر لے گئیں۔ وہاں سے سمندر بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ محترمہ پہلی مرتبہ اس محل میں رہنے کے لیے آئی تھیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا یہ محل آپ کی ضرورت سے بہت زیادہ بڑا تو نہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ 'پھر بھی مجھے یہ محل اچھا لگا ہے۔' یہ جمعرات کی شام تھی۔ محترمہ نے محل میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ فاطمہ جناح کی ایک اور دوست لیڈی ہدایت اللہ جو پہلے پاکستانی گورنر سندھ کی اہلیہ تھیں، کے مطابق اُس رات عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر قوالی کی محفل تھی اور فاطمہ جناح اور باقی مدعو خواتین تمام رات محل کے برآمدے میں بیٹھی رہیں کیوں کہ وہاں قوالی صاف سنائی دے رہی تھی۔ مشہور ہے کہ فاطمہ جناح ہر جمعرات کو عبداللہ غازی کے مزار کی قوالیاں اپنی بالکونی سے سنتیں۔ اُس وقت کراچی میں آج جیسا ٹریفک کا شور وغل نہیں تھا اس لیے سمندری لہروں کی آواز اور قوالی کی دھمال واضح سنائی دیتیں۔

موہاٹا محل سے وابستہ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اُس وقت کے صدر پاکستان ایوب خان کے خلاف تحریک کا مرکز تھا۔ اسی محل سے محترمہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کے خلاف صدارتی امیدوار ہونے کا اعلان کرتے ہوئے انتخابی مہم شروع کی تھی۔ فوجی آمر کے خلاف سیاسی حکمتِ عملی طے کرنے کے لیے یہاں بہت سے اجلاس ہوئے۔ جب تک فاطمہ جناح حیات رہیں ایوب انتظامیہ اس محل کی کڑی نگرانی کرتی رہی۔ فاطمہ جناح زندگی بھر اپنے بھائی کی برسی مناتیں۔ 11 ستمبر کو موہاٹا محل کے باغ میں قناتیں وغیرہ لگتیں اور بریانی تقسیم کی جاتی۔ قائد کی ہر برسی پر کراچی کا وہی بوہرہ شیف بریانی پکاتا جس پر محترمہ بہت اعتماد کرتی تھیں۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اسی موہاٹا محل میں اپنی زندگی کے دن پورے کیے۔ نو جولائی 1967ء کی ایک صبح محترمہ فاطمہ جناح اپنے کمرے میں سوتے ہوئے انتقال

کر گئیں۔ اُن کی رحلت کے بعد خاندان میں موہاٹا محل کی ملکیت پر تنازع کھڑا ہو گیا۔ اگلے برس قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ایک اور ہمشیرہ محترمہ شیریں جناح ہجرت کر کے پاکستان آئیں۔ اُن کی آمد سے محل کی ملکیت پر اٹھنے والا تنازع دور کرنے میں آسانی ہو گئی۔ سندھ ہائی کورٹ نے موہاٹا محل شیریں جناح کے حوالے کر دیا جو اپنی وفات، 25 ستمبر 1980ء تک وہیں مقیم رہیں۔ محترمہ شیریں جناح کی خواہش تھی کہ اُن کی زندگی کے بعد اس عمارت کو کسی فلاحی مقصد کے طور پر استعمال کیا جائے۔ بالخصوص وہ موہاٹا محل کو خواتین کے میڈیکل کالج میں تبدیل کرنے میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ تاہم وہ اپنی خواہش کو حقیقت کا روپ دینے سے پہلے ہی خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ بہر حال محترمہ شیریں جناح نے حکومت سے درخواست کر رکھی تھی کہ موہاٹا محل کو کالج نہ بن سکنے کی صورت میں کم از کم فن کی ترویج کے ادارے میں تبدیل کر دیا جائے۔ اُن کی رحلت کے بعد اُن کے رشتے داروں نے بھی موہاٹا محل کی ملکیت کے لیے عدالتوں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک عدالتی حکم نامے کے تحت عمارت کو سیل کر دیا گیا۔

1980ء میں محل سیل ہونے کے بعد اندر موجود قائدِ اعظم اور فاطمہ جناح کے نوادرات عدم توجہ کی وجہ سے خراب ہونا شروع ہو گئے۔ محل کے باغات کو بھکاریوں نے اپنی آرام گاہ بنا لیا۔ پندرہ سال بعد جب محل کھولا گیا تو اُوپر کے کمروں میں فاطمہ جناح کی سرمایہ کاری کی دستاویزات اور بہت سے ذاتی خطوط اور کاغذات زمین پر بکھرے پائے گئے۔ ایک خط میں کسی شہری نے اُنہیں صدارتی انتخاب سے دستبردار ہونے کے لیے سختی سے تنبیہ لکھی تھی کہ اُس کی معلومات کے مطابق اسلامی ریاست میں خاتون کی حکمرانی ناجائز ہے۔ اسی طرح محترمہ کے بینکوں کی چیک بکس، سٹاک میں حصص کے سرٹیفکیٹ اور متعدد خالی خاکی لفافے پائے گئے جن کے اندر کی دستاویزات یا مکتوب غائب تھے۔

1995ء میں موہاٹا محل کی تالہ بندی ختم ہوئی تو حکومت سندھ نے وفاقی حکومت کے تعاون سے اسے باضابطہ طور پر خرید لیا۔ اُسی سال سندھ کی صوبائی حکومت کی درخواست پر اُس کی وقت کی وزیرِ اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو نے موہاٹا محل خریدنے کے لیے صوبائی محکمہ ثقافت کو ستر لاکھ روپے دیے تھے۔ اس میں سے 61 لاکھ روپے محل کی خریداری پر جبکہ باقی نو

لاکھ روپے اس کی تزئین و آرائش پر خرچ ہوئے۔ کراچی کے مشہور آرکیٹکٹ حبیب فدا علی کو کام کی نگرانی سونپی گئی۔ محل کو اصل صورت میں لوٹانے کے لیے بہت محنت کی گئی یہاں تک کہ ایک بار پھر گلابی جودھ پوری پتھر میں جان سی پڑ گئی۔

یہ طے کیا گیا کہ اس یادگار کو ایک عجائب گھر میں تبدیل کیا جائے گا جو پاکستان اور مقامی خطے کی ثقافت کی عکاسی کرے گا۔ اس یادگار کو عجائب گھر میں ڈھالنے کے عمل کی نگرانی کے لیے گورنر سندھ کی سربراہی میں ایک خودمختار ٹرسٹ بورڈ قائم کیا گیا۔ ٹرسٹ کے قیام کا مقصد اس جائیداد کا بندوبست چلانا اور اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ اسے کبھی بھی کاروباری نوعیت کے مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جا سکے۔ عجائب گھر کے لیے اشیا کی خریداری اور توسیع کی غرض سے کی جانے والی تعمیرات کے لیے مالی وسائل کا انتظام ٹرسٹ نے نجی اور سرکاری امداد، عطیات اور فنڈز جمع کرنے والی دیگر سرگرمیوں سے کرنا تھا۔

بحالی کے پروگرام کے پہلے دو مراحل بہت کامیابی سے اگست 1999ء میں مکمل ہو گئے۔ 15 ستمبر 1999ء کو عجائب گھر عوام کے لیے کھول دیا گیا۔ اس کے بعد سے اس میں بہت سے اہم نمائشوں کا انعقاد ہوا ہے جن میں ایسے نوادرات پیش کیے جاتے ہیں جو عوام نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ مثلاً عمارت کے پچھلے صحن میں چند برطانوی مجسمے نصب ہیں، جیسا کہ ملکہ وکٹوریہ کا اور راج کے دوران خدمات سرانجام دینے والے سپاہیوں کا۔ یہ تمام مجسمے موہاٹا محل کا حصہ نہ تھے بلکہ انگریز دور میں کراچی کے عوامی چوراہوں پر نصب تھے۔ 1960ء کے فسادات میں جب مجسموں کو نقصان پہنچا تو ڈپٹی کمشنر کراچی نے ان کے تحفظ کے لیے گوداموں میں مقفل کر ڈالا، لہٰذا 1995ء تک بچ گئے۔ یہاں محل میں ثقافتی عجائب گھر قائم ہوا تو عوامی نمائش کے لیے یہ مجسمے یہاں نصب کر دیے گئے۔ (4) موضوعاتی ساخت رکھنے والے بہت سے دیگر نوادرات سرکاری اور نجی ملکیت سے حاصل کیے گئے ہیں۔ 1999ء میں عجائب گھر کی صرف تین گیلریاں تھیں جو 2005ء میں بڑھ کر 44 تک جا پہنچیں۔

اس محل کا سرکاری نام ''قصرِ فاطمہ'' ہے اور سرکاری ریکارڈ و کاغذات میں ایسے ہی درج ہے۔ تاہم شاید ہی کوئی اسے اس نام سے جانتا ہے۔ سیٹھ و بیگم موہاٹا کے پیار کی کہانی

اتنی مضبوط ہے کہ محل کے در و دیوار سے اس کا عکس جھلکتا ہے اور آج بھی یہ محل انہی کے نام سے موسوم ہے۔ موہاٹا محل عجائب گھر کراچی کے شہریوں کے لیے جائے افتخار ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ یہ عجائب گھر عالمی شہرت کا حامل بن کر شہر میں امید اور بہتر مستقبل سے لگن کی شمع روشن کرے گا۔

ضمیمہ ر

مزارِ قائدِ اعظم

(مکانِ دائمی استراحت)

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا مزار کراچی کی مخصوص پہچان ہے۔ یہ شہر میں سیاحوں کی سب سے مقبول منزل ہے۔ اپنی تعمیر کے وقت یہ بیسویں صدی کے کسی بھی قومی درجے کے سیاسی رہنما کا تعمیر کیا گیا ایشیا کا سب سے بلند مزار تھا۔ ستمبر 1948ء میں بابائے قوم کا انتقال ہوا تو حکومت کے سامنے تدفین کی جگہ کے تعین کا مسئلہ درپیش ہوا۔ قائد کی رحلت کا سنتے ہی وزیراعظم لیاقت علی خان گورنر جنرل ہاؤس پہنچے اور سول و عسکری افسران کے اجلاس کی صدارت فرمائی جو رات 2 بجے کے بعد تک جاری رہا۔ فوجی حکام کو سرکاری اعزاز سے تدفین کی تیاری اور ریہرسل کا حکم ملا تو سول افسران کو تدفین کی جگہ کی تلاش کرنے کا۔ کمشنر کراچی، ہاشم رضا، پولیس چیف کاظم صاحب کے ساتھ پوری رات کراچی میں گھومتے رہے۔ آخر کار جمشید کوارٹرز سے ملحق ایک رقبے کا انتخاب کیا گیا۔ یہ پاکستان کے دارالحکومت کراچی شہر کا تقریباً مرکز تھا۔ دیگر علاقوں کی نسبت یہاں زمین کی سطح بلند ہونے کی وجہ سے یہ مثالی جگہ تھی جہاں سے مزارِ قائد دُور دُور سے دکھائی دے سکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہاں دو لاکھ سے زائد مہاجرین کے خیمے نصب تھے اور ہر طرف گندے پانی کے گڑھے ابل رہے تھے۔ تاہم نگاہِ انتخاب یہاں ٹھہر گئی۔

آخر کار یہاں دنیا کے خوبصورت ترین مزارات میں سے ایک سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کیا گیا۔ اس کے اردگرد وسیع و عریض باغ ہے جو کروڑوں کی آبادی اور ہنگامہ خیز زندگی رکھنے والے اس شہر میں نہایت پرسکون اور کیف آفریں ماحول فراہم کرتا ہے۔ مزار کا طول و عرض مساوی طور پر 75x75 میٹر (246x246 فٹ) ہے؛ اونچائی 43 میٹر (141 فٹ) ہے اور یہ چار میٹر (13 فٹ) بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ چاروں طرف کی دیواروں میں ایک ایک بلند و بالا داخلی محراب ہے جس میں تین تین دروازے ہیں۔ چبوترے کے سامنے سے لے کر بیرونی گیٹ تک پندرہ فوارے قطاروں میں لگے ہوئے ہیں۔ مزار کے اندرونی حصے میں چہار پہلو کرسٹل کا سبز فانوس ہے جو عوامی جمہوریہ چین کی طرف سے بطور تحفہ دیا گیا ہے۔ مزارِ قائد کے اردگرد ایک پارک ہے جس میں سپاٹ لائٹس نصب ہیں جو رات کو سفید مزار پر پڑتی ہیں تو یہ روشن مقبرہ بقعۂ نور دکھائی دیتا ہے۔ (5)

تعمیر کے مراحل: 1948ء میں جب پاکستان کے پاس وسائل بہت محدود تھے تو یقیناً مزار کی تعمیر کے لیے رقم کی فراہمی آسان نہ تھی۔ چنانچہ قائد کے جانشیں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے بانیٔ پاکستان کی رحلت کے فوراً بعد قائدِاعظم میموریل فنڈ کے قیام کا اعلان کیا اور چندہ کی اپیل کی۔ پاکستان کے عوام نے اُن کی اپیل کا والہانہ انداز میں جواب دیا اور سرکاری اور نجی ذرائع سے فنڈ میں عطیات جمع ہونے لگے۔

سب سے پہلے تو تدفین کی جگہ سے بھارت سے آنے والے مسلمان مہاجرین کے بنے ہوئے عارضی مکانات کا انخلا کرایا جانا تھا۔ مہاجرین سے مزارِ قائد کی تعمیر کے لیے علاقہ خالی کرنے کی درخواست کی گئی جو قائد کے احترام میں اُس جگہ سے فوراً اٹھ گئے۔ اُنہیں کراچی کے دیگر علاقوں میں جگہ الاٹ کر دی گئی جو پاکستان کے اُس وقت کے گورنر جنرل اور وزیراعظم کے ناموں کی نسبت سے بالترتیب ناظم آباد اور لیاقت آباد کہلاتے ہیں۔ تاہم قبر کے مقام سے دور خیمے قائم رہے اور تمام مہاجرین کے انخلا میں مزید بارہ سال لگے۔ اس عرصہ میں ان کے درمیان قائداعظم کی کچی قبر ایک شامیانے کے سائے میں موجود رہی۔

31 دسمبر 1953ء تک فنڈز میں 2 کروڑ 60 لاکھ 36 ہزار روپے جمع ہو چکے

تھے۔ شروع میں گورنر جنرل کی سربراہی میں ایک کمیٹی اس فنڈ کی نگرانی کرتی تھی۔ 1956ء کے آئین کے نفاذ سے اس کی نگرانی صدرِ پاکستان کے پاس چلی گئی۔ فیصلہ کیا گیا کہ بانیٔ پاکستان کو شایانِ شان خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اُن کے مزار کی عمارت بھی انتہائی شاندار اور بے مثال ہوگی۔ یہ یادگار مسلمانوں کے روایتی اور جدید طرزِ تعمیر کا امتزاج ہونا تھی۔ شروع شروع میں قائد کی یاد میں درج ذیل چار یادگاروں کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا لیکن مزارِ قائد کے علاوہ باقی تینوں منصوبوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

1۔ مزارِ قائد (کراچی)

2۔ کراچی ہی میں ایک قومی جامع مسجد (جو کہ مجوزہ مزارِ قائد سے متصل شاہراہ قائدین کے ساتھ تعمیر ہونا تھی)۔

3۔ ملتان میں ایک دارالعلوم

4۔ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی

مرکزی کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 21 جنوری 1956ء میں فیصلہ کیا گیا کہ رقم کی کمی کی وجہ سے صرف مزارِ قائد کی تعمیر اور ملحق باغ پر توجہ دی جائے گی۔ اس کے بعد فنڈز ہوئے تو دیگر یادگاروں کی باری آئے گی۔ 1958ء میں مزار کے تعمیر کے لیے عالمی سطح پر تعمیراتی ڈیزائن کا ٹینڈر دیا گیا۔ بہت سے عالمی شہرت یافتہ ماہرینِ تعمیرات نے ڈیزائن پیش کیے۔ ترک ماہر تعمیرات اے واصفی عجلی، بھارتی ماہر تعمیرات نواب زین یار جنگ اور ایک برطانوی ماہر تعمیرات ریگلن سکویر کے پیش کردہ ڈیزائن پر کافی دیر تک غور کیا گیا۔ ان ڈیزائنز کو منظور نہ کیا گیا۔ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جو بھی ڈیزائن حکومتی کمیٹی کو پسند آتا، وہ محترمہ فاطمہ جناح مسترد کر دیتیں اور جو انہیں ٹھیک لگتا، سرکاری افسران کو اس پر تحفظات ہوتے۔

آخر کار محترمہ فاطمہ جناح کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے یہ ذمہ داری بمبئی سے تعلق رکھنے والے ایک بھارتی مسلمان ماہر تعمیرات مسٹر یحییٰ سی مرچنٹ کو سونپی گئی۔ مسٹر مرچنٹ قائدِاعظم کے بمبئی کے دورِ زندگی میں ان کے دیرینہ دوست اور جائیداد کے معاملات میں مشیر رہے تھے۔ مسٹر یحییٰ سی مرچنٹ نے دسمبر 1959ء میں اپنا ڈیزائن پیش کیا۔ کمیٹی نے

محترمہ فاطمہ جناح کی مذکورہ خواہش کے مدِنظر اسے منظور کرلیا۔ بالآخر مزار کی تعمیر پر کام 1960ء میں شروع ہوا۔ یہاں یہ بات افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گی کہ قائد کے مزار کا سنگ بنیاد رکھنے میں بارہ سال لگ گئے۔ ان بارہ سالوں کے دوران بانیٔ پاکستان کی آخری آرام گاہ کے اُوپر ایک شامیانہ سایہ کیے ہوئے تھا۔ بہرحال منصوبے پر کام بہت وسیع پیمانے پر شروع ہوا جس میں سینکڑوں مزدوروں اور سول انجینئروں نے مزار کی تعمیر پر انتھک محنت کی۔

ترجیح مزار کی مرکزی عمارت کی تعمیر کو دی گئی، وہی مزار جو آج پُروقار، ممتاز اور شان دار عمارت کے طور پر فن اور عقیدت کا امتزاج لیے روشنیوں کے شہر کراچی میں کھڑا ہے اور جس کی جنوبی ایشیا بھر میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ یہ ہمارے ثقافتی ورثے کی نمائندگی کرنے کے علاوہ مسلمانوں کے روایتی اور جدید فنِ تعمیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ صدرِ پاکستان محمد ایوب خان نے 31 جولائی 1960ء کو مزارِ قائد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مقبرے کی بنیادوں میں پاکستان کے پرانے سکے اور قراردادِ پاکستان 1940ء کی دستاویزات بھی دفن کیے گئے۔ اگرچہ تعمیراتی کا کام کا آغاز قریباً پانچ ماہ پہلے یعنی 8 فروری 1960ء سے ہی ہو چکا تھا۔ بنیادوں کی کھدائی 7 مارچ 1961ء سے شروع ہوئی۔ بیسمنٹ کی تعمیر پر کام کا آغاز سات مئی 1961ء کو ہوا جو 10 مارچ 1962ء کو مکمل ہوا۔ بالائی ڈھانچے پر کام یکم اگست 1962ء کو شروع ہو کر 31 مئی 1966ء کو مکمل ہوا۔ منصوبے کی نگرانی زاہد حسین ایکس ای این پی ڈبلیو ڈی نے کی جن کی معاونت ڈائریکٹر پارکس اے کے خان اور سپروائزر حافظ اسلام الدین کرتے رہے۔

1965ء میں جب محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی انتخابات میں صدر ایوب خان کو چیلنج کر دیا تو وہ محترمہ سے نالاں رہنے لگے۔ انتخاب تو وہ بیس ہزار ووٹوں سے جیت گئے لیکن صدر ایوب نے اپنے نئے دورِ صدارت میں مزارِ قائد کی تعمیر میں دلچسپی بالکل کم کر دی۔ ظاہر ہے کہ تعمیر کا عمل قدرے سست ہو گیا تاہم قائدِاعظم میموریل کمیٹی اس کی نگرانی کرتی رہی۔ مزار پر سنگِ مرمر کا کام 6 اگست 1966 کو شروع ہوا جو کہ ایک بہت محنت طلب کام تھا اور جس کے لیے بے حد احتیاط اور مہارت درکار تھی۔ مستری محمد اسحاق اور احمد خان

نے یہاں سنگ مرمر کا کام کر کے تاریخ میں اپنا نام رقم کروالیا۔ اس پیچیدہ کام کے لیے اعلیٰ مہارت رکھنے والے سنگ تراشوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مزار کی بالائی عمارت کی تعمیر میں چھے ہزار ٹن سیمنٹ، 21,200 مکعب فٹ سنگِ مرمر، پانچ سو ٹن عمدہ کوالٹی کا فولاد اور بار ہ ٹن تانبا استعمال ہوا۔

مزار کی مرکزی عمارت پیمائش کے اعتبار سے 116 x 116 مربع فٹ ہے۔ مرکزی گنبد ہشت پہلو جس کی اندرونی وسعت کی چوڑائی بائیس فٹ اور اونچائی چھتیس فٹ ہے۔ یہ ایک عظیم الشان عمارت ہے جس کی دیواریں متوازن نمونے کے ملاگوری سفید سنگِ مرمر سے بنی ہیں۔ قائدِاعظم کی اصل قبر تہہ خانے میں ہے مگر اس کی ہم شکل نشانی مزار کی مرکزی عمارت میں زمینی منزل (گراؤنڈ فلور) پر بھی بنائی گئی ہے جس کے ارد گرد 18,000 تولہ چاندی سے بنا 13x10 فٹ کا جالیوں کا کٹہرا ہے۔ اس کے باہر 17 فٹ چوڑا اور 21 فٹ لمبا پیتل اور کانسی کا جنگلا ہے۔ چاندی اور پیتل کا سارا کام دو ماہر کاریگروں لیاقت حسین اور حافظ صدیق کی سربراہی میں ہوا۔ پھولوں کی چادر چڑھانے کی تمام سرکاری اور عسکری تقریبات اسی ہم شکل قبر پر ادا کی جاتی ہیں جس کے اوپر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ تہہ خانے میں اصل قبر تک رسائی خال خال ہی دی جاتی ہے۔ مرکزی کمرے کے چاروں کونوں سے چار زینے تہہ خانے میں اترتے ہیں جس کے مرکز میں قائدِاعظم اپنی اصلی قبر میں محوِ خواب ہیں۔

بالکونی تک جانے والے زینوں کی بلندی 52 فٹ ہے۔ بالکونی کی سطح پر ہشت پہلو ہال ایک دائرے کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی بیرونی دیوار گول ہے۔ یہیں سے 70 فٹ کا گنبد بلند ہوتا ہے۔ 14 فٹ بلند گول دیواروں پر تعمیر مرکزی گنبد مضبوط کنکریٹ کا بنا ہوا ہے۔ تمام عمارت زلزلہ کا جھٹکا برداشت کرنے کی صلاحیت کے ساتھ بنی ہے۔ اندرونی دیواروں پر سبز سنگِ مرمر کی نقاشی کی گئی ہے۔ گنبد سے لٹکے اور سونے کے ورقوں سے ڈھکے ہوئے 22 میٹر لمبائی کے فانوس چار تہوں میں 48 بتیاں مزین ہیں۔ البتہ یہ وہ فانوس نہیں ہے جو چین کے مسلمانوں کی طرف سے 1970ء میں مزار کی تکمیل پر پاکستان کے لیے تحفے کے

طور پر وصول ہوا تھا، بلکہ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

قصہ مختصر مزارِ قائد کی تعمیر میں ایک عشرہ لگ گیا اور کام پھر بھی مکمل نہ ہوا۔ بالآخر صدر ایوب خان کی حکومت ختم ہوگئی اور جنرل یحییٰ خان نے نئے صدر کے طور پر عہدہ سنبھالا۔ انہوں نے اپریل 1970ء میں زیرِ تعمیر مزار کا دورہ کیا اور عدم تکمیل پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چیف آف سٹاف جنرل غلام محی الدین پیرزادہ کو کام کی نگرانی سونپی۔ بالآخر اگلے 9 ماہ میں کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اُس وقت کے صدرِ پاکستان آغا محمد یحییٰ خان نے 15 جنوری 1971ء کو اس کا افتتاح کیا اور عوام کے لیے کھول دیا۔ اس کی تعمیر کی کُل لاگت ایک کروڑ 48 لاکھ روپے آئی۔ مزار کے لیے کُل مختص رقبہ 131.71 ایکڑ جس میں سے فی الحال صرف 61 ایکڑ میں مزار اور باغِ قائدِ اعظم واقع ہے جبکہ باقی 70.58 ایکڑ بیرونی دیوار کے ساتھ خالی ہیں جنہیں مستقبل کے ترقیاتی کاموں کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے۔

باغِ قائدِ اعظم: سرسبز ماحول جمالیاتی ذوق کو جلا بخشتا ہے۔ باغات اور فوارے انسانوں کو ہمیشہ خوشی بخشتے ہیں۔ بادشاہ، نواب بلکہ عام انسان بھی زمانۂ قدیم سے باغات لگانا پسند کرتے ہیں۔ ہم بابل کے معلق باغات کے بارے میں جانتے ہیں جن کا شمار سات عجاباتِ عالم میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی، فنِ تعمیر اور اُنہیں لگانے کے لیے کی گئی محنت کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ویسے بھی باغات لگانا برِصغیر پر راج کرنے والے بادشاہوں کا مشغلہ رہا ہے۔ مغل بادشاہوں نے لاہور کے شالامار باغ سمیت بہت سے باغات لگائے۔

قائدِ اعظم اور بیگم مریم جناح کو قدرتی مناظر پسند تھے۔ وہ کشمیر اور شملہ کے سرسبز باغات اور پہاڑیوں میں چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ ملیر کی تازہ ہوا اور پرسکون علاقہ قائد کو مرغوب تھا جہاں ساحل کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظم کی بیس ایکڑ زرعی اراضی بھی تھی۔ اُس وقت کراچی بذاتِ خود ایک صاف ستھرا اور منظم شہر تھا۔ موجودہ دور جیسی بے ہنگم ٹریفک، شور اور فضائی آلودگی سے اُس وقت کا کراچی ناآشنا تھا۔ مزارِ قائد تعمیر کرنے والے حکام نے اس کے اردگرد ایک وسیع و عریض باغ کے لیے کافی جگہ چھوڑ دی تھی۔ تاہم اس خواہش کو حقیقت بنانے میں کئی عشرے لگ گئے۔ مزار کے افتتاح کے مزید پندرہ سال بعد 14 فروری 1986ء

کو وزیرِ اعظم پاکستان محمد خان جونیجو نے اعلان کیا کہ مزارِ قائد کے گرد لاہور کے شالامار باغ کی طرز پر ایک باغ لگایا جائے گا۔

شروع میں فیصلہ کیا گیا کہ باغات کی تعمیر کے لیے 96 ایکڑ زمین استعمال کی جائے گی۔ مزید بیس ایکڑ زمین مزارِ قائد کے انتظامی دفاتر اور کچھ دیگر عمارات کے لیے مختص تھے۔ تاہم کابینہ کی کمیٹی نے بلڈنگ کمپلیکس کا تصور ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے مخصوص اراضی پر خواتین، بچوں اور خصوصی افراد کے لیے پارک بنانے کا منصوبہ بنایا۔ مارچ 1986ء کو ڈیزائن اور PC-1 کی ذمہ داری PEPAC Ltd کو سونپی گئی جبکہ کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی (کے ڈی اے) کے ڈیزائن آفس کے سید ضیغم ایس جعفری اس کے مشیر تعمیرات مقرر ہوئے۔ اس منصوبے کے معاہدے پر 18 جون 1987ء کو دستخط ہوئے۔ موجودہ ڈیزائن کی منظوری قائدِ اعظم مزار مینجمنٹ بورڈ یعنی QMMB نے 31 دسمبر 1996ء کو دی۔ مزید تین سال بعد صدر پاکستان رفیق تارڑ نے 28 اگست 1999ء کو باغ کے سنگِ بنیاد کا فیتہ کاٹا۔ تین ماہ بعد نواز حکومت کا تختہ الٹا تو نئے حکمران پرویز مشرف نے باغ کا تمام کام فوج کے سپرد کر دیا۔ اُنھوں نے بریگیڈیئر آصف غزالی کی قیادت میں انجینئرنگ کور کو باغ کا کام جلد از جلد نمٹانے کا حکم دیا جو دس ماہ کے قلیل عرصے میں مکمل کر لیا گیا۔ 1996ء میں منظوری کے ٹھیک چار سال بعد 24 دسمبر 2000 کو، قائد کی 125 ویں سالگرہ سے ایک دن پہلے اُس وقت کے صدر پرویز مشرف نے باغات کا افتتاح کر دیا۔ یوں قائدِ اعظم کی رحلت کی نصف صدی سے بھی زائد وقت میں آپ کا مزار اور ملحقہ باغات تکمیل کو پہنچے۔

چوں کہ مزارِ قائد ملک کی انتہائی اہم عمارت ہے، اس لیے اس کے اردگرد سبزہ لگانے کا منصوبہ اس طرح بنایا گیا کہ عمارت کو درخت کسی طرف بھی نظروں سے اوجھل نہ کر دیں۔ مزار سے ملحق باغات کا ڈیزائن چاروں طرف مرکزی عمارت اور چبوترے کے متوازی بنایا گیا۔ مساوی رقبہ رکھنے والے باغات کے درمیان پیدل چلنے کے راستے اور آبی گزرگاہیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی جائے اتصال پر ایک بڑا سا فوارہ ہے۔ ان پندرہ فواروں میں سے ہر ایک کے تالاب کی لمبائی 50 فٹ، چوڑائی 28 فٹ اور گہرائی 3 فٹ

ہے۔ سامنے کا تمام علاقہ پانچ لیول سے محمد علی جناح روڈ اور چار لیول سے شاہراہِ قائدین کے سامنے ہے۔ آرائش اراضی یعنی لینڈ اسکیپ کے لیے استعمال کیا گیا تمام مواد مقامی طور پر تیار کیا گیا ہے۔

باغ میں پانچ ہزار درخت اور اڑتیس اقسام کے پھول دار پودے لگائے گئے ہیں۔ پھلدار ناریل کے درخت باغ کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں جبکہ خوشبودار پھول جیسا کہ چنبیلی، گارڈینیا، سرخ گلاب وغیرہ ماحول کی تازگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ نظام کو چلانے کے لیے شروع میں یومیہ تین لاکھ گیلن پانی درکار تھا۔ ایک مرتبہ جب نظام چل چکا تو اب روزانہ ڈیڑھ لاکھ گیلن پانی کافی ہوتا ہے۔ باغ میں برقی روشنیاں اس طرح لگائی گئی ہیں کہ سب کی روشنی مزار کی عمارت پر پڑتی ہے۔ کُل 870 بتیاں لگائی گئی ہیں جن میں سے 111 بلب مزار کی بیرونی عمارت کو جگمگانے کے لیے ہیں جبکہ آبی گزرگاہوں میں 248 لائٹس زیرِ آب ہیں۔ ان سب کے علاوہ مزار کے چبوترے کے چاروں کونوں پر ایک ایک 90 فٹ بلند ٹاور نصب کیا گیا ہے۔ بیرونی دونوں ٹاوروں پر 12، 12 اور اندرونی دونوں ٹاور پر 7، 7 سرچ لائٹس لگائی گئی ہیں۔ یہ 38 سرچ لائٹس سرِشام ہی روشن کردی جاتی ہیں جن کی روشنی چاروں طرف سے مزار کی مرکزی عمارت پر پڑتی ہے تو وہ بقعۂ نور کا منظر پیش کرتا ہے۔

مارچ 1986ء میں کیے گئے فیصلے کے باوجود ابھی بھی 20 ایکڑ پر بچوں کا پارک بنایا جانا باقی ہے جس کا ڈیزائن پاکستان کے نقشے جیسا ہوگا اور اس میں مختلف علاقوں کی سرزمین کی عکاسی کی گئی ہوگی۔ اس میں اہم عمارات کے ماڈل اُن کی اصل مقامات کے ساتھ بنائے جائیں گے۔ افسوس قیامِ پاکستان کے تین چوتھائی صدی کے بعد بھی مزارِ قائد اور ملحقہ باغات کے قومی اہمیت کے منصوبے کے کئی پہلوؤں پر کام مکمل ہونا تو درکنار شروع بھی نہ ہوسکا۔

قائدین کی قبور: مزارِ قائد کے مشرق میں ایک بڑے سے ہال میں پانچ رہنماؤں کی قبور ہیں: قائد کی چھوٹی بہن محترمہ فاطمہ جناح، پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم شہیدِ ملت لیاقت علی خان اور اُن کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت علی خان، پہلے نائب وزیرِاعظم پاکستان سردار

عبدالرب نشتر اور 1971ء سے پہلے متحد پاکستان کے آخری وزیرِاعظم نورالامین۔ تمنا ہے کہ قائدِاعظم کی محبوب اہلیہ بیگم مریم جناح کے جسدِ خاکی کو بمبئی سے لاکر پورے سرکاری اعزاز واحترام سے قائد کے پہلو سپردِ خاک کیا جائے۔

ایوانِ نوادراتِ قائدِاعظم: مزار کے مغربی جانب ایک بڑا سا ہال ہے جس میں قائدِاعظم سے وابستہ نوادرات کی نمائش کی گئی ہے۔ اس میں قائد کے ذاتی استعمال کی اشیا بھی ہیں جیسا کہ اُن کے استقبالیہ خطبے، مدح میں نظمیں، دو کاریں، قرآنِ مجید کے نسخے، استقبالیے، ملبوسات، جوتے، ڈاک کی ٹکٹیں، کرنسی نوٹ، کاغذات، فرنیچر، قالین، ظروف، چھری کانٹے، گلاس، اشیائے زیبائش اور قائد کے ذاتی ہتھیار وغیرہ۔ میموریل کمرے میں موجود نوادرات قائد کی بہن محترمہ شیریں جناح نے عطیہ کی تھیں۔ دیگر تمام یادگاری اشیا 1969ء میں حکومتِ پاکستان کے قائم کردہ ایک انکوائری کمیشن نے اکٹھی کی تھیں۔ قائد کے رفیقِ خاص ایم اے ایچ اصفہانی اس کمیشن کے چیئرمین جبکہ راجہ صاحب محمود آباد اور ڈاکٹر الیف اے خان، اُس وقت کے محکمہ آثارِ قدیمہ کے ڈائریکٹر، اس کے اراکین میں شامل تھے۔ نوادرات کو شناخت کرنے کے بعد ان کی صفائی کی گئی اور کیمیائی طریقے سے محفوظ کرکے 1970ء میں محکمہ آثارِ قدیمہ اور مزارِ قائد کے انتظامی بورڈ (کیو ایم ایم بی) کے حوالے کردیا گیا۔ یہ تمام نوادرات قوم کے استفادہ کے لیے مزارِ قائد کے اس عجائب گھر میں نمائش میں رکھے ہیں۔

مزار کا انتظام وانصرام ایک ٹرسٹ کی ذمہ داری ہے۔ اس وقت گورنر سندھ کی سربراہی میں ٹرسٹ ممبران کی تعداد چودہ ہے۔ ان میں چار افسران بلحاظ عہدہ ہیں (چیف سیکرٹری سندھ، وفاقی سیکرٹری وزارتِ قومی ورثہ، ڈائریکٹر جنرل محکمہ آثارِ قدیمہ وعجائب گھر اسلام آباد اور سندھ کے صوبائی سیکرٹری برائے ثقافت وسیاحت) جبکہ باقی دس آزاد ممبران یہ ہیں: حمید الیس ہارون، شوکت ترین، شیری رحمان، عبدالحمید اخوند، توفیق چنائے، پروفیسر محمد داؤد خان، جہانگیر صدیقی، ایڈووکیٹ مخدوم علی خان، نصرت جمیل اور اکرم دوست۔ ایگزیکٹو کمیٹی ٹرسٹ کے چار ممبران پر مشتمل ہے جن کا عجائب گھر کی فعالیت کی بابت باقاعدگی

سے اجلاس ہوتا رہتا ہے۔ ٹرسٹی اور ایگزیکٹو کمیٹی ڈائریکٹر عجائب گھر (نسرین عسکری) کے ذریعے تمام امور سرانجام دیتے ہیں۔

پاک چین دوستی اور مزارِ قائد میں حالیہ اضافہ: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ قائدِاعظم کے مزار کی تکمیل پر ایک خوبصورت فانوس چین نے قائدِاعظم کے احترام میں مزار پر نصب کرنے کے لیے تحفتاً دیا تھا۔ تاہم 2016ء تک یہ فانوس 46 سال پرانا ہو چکا تھا۔ اس لیے اُس سال چین کے صدر شی جن پنگ نے 1.2 ٹن کا ایک نیا فانوس تحفے میں دیا۔ لیزر ٹیکنالوجی سے بنے فانوس کو پچھلے کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ بتیوں اور تہوں کی تعداد تو وہی ہے البتہ لمبائی معمولی (اڑھائی میٹر) کم ہے۔ اس پر ساڑھے آٹھ کلو سونا استعمال ہوا ہے اور پرانے فانوس کی نسبت بہت شاندار دکھائی دیتا ہے۔ صدرِ پاکستان کے نام اپنے خط میں چینی صدر نے اس فانوس کو دونوں ملکوں کی لازوال دوستی کی علامت قرار دیا۔ 25 دسمبر کو قائدِاعظم کے 140 ویں یومِ پیدائش پر صدر ممنون حسین نے اس کا فیتہ کاٹا۔

15 جنوری 1971ء کو مزار کے افتتاح کے ساتھ ہی پاک بحریہ کو حفاظت اور اعزازی تقریبات کے فرائض سونپے گئے کیوں کہ قائداعظم کی حلف برداری اور جنازہ پر پاک نیوی نے ہی رسمی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ چار ماہ بعد 15 مئی 1971ء کو پاک فوج اور مزید چار ماہ بعد یعنی 15 ستمبر 1971ء کو پاک فضائیہ کو مزارِ قائد کی اعزازی ذمہ داریاں دی گئیں۔ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے کہ تینوں مسلح افواج اسی ترتیب سے سال کے چار ماہ مزارِ قائد کی حفاظت کی ذمہ داریاں نبھاتی ہیں۔

دن کے اوقات میں ہر ایک گھنٹے بعد ایک نہایت پُروقار قریب میں گارڈ اپنی پوزیشن تبدیل کرتے ہیں۔ سال میں چار مرتبہ یعنی یومِ جمہوریہ (23 مارچ)، یومِ آزادی (14 اگست)، قائداعظم کے یومِ وفات (11 ستمبر) اور قائداعظم کے یومِ پیدائش (25 دسمبر) پر فوجی اعزاز کے ساتھ زبردست تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

21 ہزار مکعب فٹ سے زائد سنگ مرمر، 225 کلو سے زائد چاندی اور 8 کلو سے زائد سونے سے بنا یہ عظیم مزار، پاکستانی قوم کی طرف سے بانیٔ مملکت کے نام آخری سلام ہے۔

ضمیمہ کے حواشی

(1)۔ دانیال شاہ، ایکسپریس ٹریبون، (سنڈے میگزین)، 15 مارچ 2015ء

(2)۔ یہ حصہ موہاٹا محل عجائب گھر کی ویب سائٹ http://www.mohattapalacemuseum.com/ پر دی گئی معلومات کی تلخیص اور اختصار پر مبنی ہے۔ ویب سائٹ سے 21 اکتوبر 2017ء کو استفادہ کیا گیا۔

(3)۔ کنور خالد یونس، ''مدیر کے نام خطوط''، روزنامہ ڈان، کراچی، 15 نومبر 2009ء۔

(4)۔ اختر بلوچ، موہاٹا محل: ''گمشدہ محبت کی کہانی''، روزنامہ ڈان، کراچی، 28 جولائی 2014ء

https://www.dawn.com/news/112216

(5)۔ مزارِ قائد عجائب گھر کے بارے میں معلومات پر مبنی یہ حصہ مزارِ قائد انتظامی بورڈ کی سرکاری ویب سائٹ سے حاصل کردہ معلومات کی تلخیص اور اختصار پر مبنی ہے۔ ویب سائٹ سے 10 نومبر 2017ء کو استفادہ کیا گیا۔

حرفِ آخر

زیرِ نظر کتاب مکمل ہو چکی تھی کہ کچھ نادر معلومات اور نادر تر مشورے ملے۔ سب سے اہم یہ کہ معروف سکالر عقیل عباس جعفری صاحب نے میری توجہ سٹیٹ بینک آف پاکستان کی 2008ء میں شائع کردہ کتاب، ''قائداعظم کی جائیداد اور سرمایہ کاری'' کی طرف دلوائی جس کا پیشگی علم راقم الحروف کو نہ تھا اور جس کے بغیر موجودہ کتاب کے باب 7، 8 اور 9 لکھنا ممکن نہ ہوتے جو کہ قائداعظم کی زرعی اراضی، منقولہ رقوم اور صنعتی سرمایہ کاری کے متعلق ہیں۔ اس زبردست کارنامے پر میں کتاب کے مصنف ملک محمد ریاض کو سلام پیش کرتا ہوں۔

تاہم مذکورہ کتاب میں قائداعظم کی غیر منقولہ جائیداد کے حوالے سے کچھ سوالات سامنے آئے، مثلاً یہ کہ جناب ملک ریاض، جناح منزل کراچی کی قیمت 1,80,000 روپے بتاتے ہیں جبکہ جناح ہاؤس میوزیم کے اپنے ذرائع اپنے معلوماتی بروشرز میں قیمت 1,15,000 روپے درج کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک ریاض، جناح منزل بمبئی کا سالِ خرید 1916ء بتاتے ہیں جبکہ حاجی عزیز دوسا اس کو 1912ء لکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ ملک ریاض یہ ماننے کو تیار نہیں کہ قائداعظم کے نکاح نامے میں 1,25,000 روپے بطور دلہن کو تحفہ جناح منزل بمبئی کے بارے میں ہے۔ حاجی دوسہ کی گواہی کے رد میں مذکورہ مصنف کہتے ہیں کہ یہ قیمت ہیرے کے زیورات کی ہوگی جو بیگم

صاحبہ کو شادی پہ دیے گئے ہوں، یا پھر Simplex مل کے 1,25,000 روپے کے وہ حصص ہوں گے جو آپ نے 1912ء میں خریدے تھے اور ممکن ہے کہ نکاح کے وقت بیگم صاحبہ کے نام کر دیے ہوں۔

یہ بات تو طے ہے کہ قائداعظم نے 1918ء میں شادی پہ ایک ہزار روپیہ بطور حق مہر کے علاوہ 1,25,000 روپے کا کوئی تحفہ اپنی دلہن کو دیا تھا۔ اور تحفے کی جگہ محض اس کی قیمت نکاح نامے پر درج ہے جو تحفے کا واحد دستاویزی ثبوت ہے۔ اگر تحفہ میں مکان دینے کا کوئی ثبوت نہیں تو زیورات دینے کا بھی نہیں ہے۔ تاہم بیشتر واقعاتی شہادتیں قائداعظم کے قریبی دوست اسماعیل دوسا کے صاحبزادے عزیز دوسا کی تحریریں اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ یہ تحفہ دراصل ساؤتھ کورٹ نامی بنگلہ ہی تھا جو قائداعظم نے اپنی شادی سے پہلے بمبئی میں خریدا تھا۔

ایک اور بات جس میں ملک ریاض صاحب باقی تحقیقات سے اختلاف کرتے ہیں، وہ جناح منزل (سابق فلیگ سٹاف ہاؤس) کراچی کے آرکیٹیکٹ کا نام ہے۔ جس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ جے ایچ سومائی نے بنوایا تھا جبکہ باقی ذرائع میں آرکیٹکٹ کا نام موسیٰ (موسز) سمو کے درج ہے جو لاہور کے ایک عراقی نژاد یہودی خاندان میں پیدا ہوا لیکن زندگی کا بیشتر حصہ کراچی میں ایک مشہور ماہر تعمیرات کے طور پر گزارا۔ 1940ء کی دہائی میں اس نے برطانیہ کی شہریت حاصل کر لی اور وہیں 1947ء میں اس کا انتقال ہوا۔ بہت کوشش کے باوجود راقم الحروف کو جے ایچ سومائی نام کے کسی آرکیٹیکٹ کے وجود کا سراغ نہ مل سکا۔ بہرحال ممکن ہے کہ سومائی نے 1868ء میں اصل بنگلہ ڈیزائن کیا ہو جبکہ سمو کے نے 1920ء کی دہائی میں اس بنگلے کی تعمیرِ نو کی ہو۔

متنازع معاملات کی بات چل نکلی ہے تو یہاں پر قائداعظم کی وصیت اور اس پر عمل درآمد پہ بھی چند آخری معروضات پیش خدمت ہیں۔ قائداعظم نے وصیت پر عمل درآمد کے لیے اسی وصیت نامے میں تین افراد محترمہ فاطمہ جناح، لیاقت علی خان اور محمد علی چائے والا کو موصی و عامل مقرر کیا۔ محمد علی چائے والا صاحب نے بمبئی میں آباد رہنے کا

فیصلہ کیا، لہٰذا اُن کی جگہ قائداعظم کے دوست ایم اے ایچ اصفہانی کو موصی نامزد کیا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت پر ان کی جگہ سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر غلام مصطفیٰ شاہ اور پھر ایس ایم کالج کے پرنسپل حسن علی عبدالرحمٰن کو شامل کیا گیا۔

جب فاطمہ جناح 1967ء میں فوت ہوئیں تو ان کی جگہ بہن شیریں جناح کو لیا گیا۔ جب وہ بھی 1980ء میں انتقال کر گئیں تو ان کی جگہ بھانجے لیاقت مرچنٹ کو شامل کیا گیا۔ باقی ممبران بھی انتقال کر گئے تو سابق کمشنر کراچی ہاشم رضا اور پھر جسٹس حیات محمد جونیجو عامل مقرر ہوئے۔ جونیجو صاحب، کینیڈا جا بسے تو جسٹس زیڈ اے چنا اور ہاشم صاحب کے بعد شریف الدین پیرزادہ، قائداعظم علی گڑھ ٹرسٹ کے ٹرسٹی بنے۔

سٹیٹ بینک آف پاکستان کی شائع کردہ مذکورہ بالا کتاب نے وصیت کے حوالے سے بھی بہت سے سوالات اٹھائے۔ حیرت ہے کہ ابھی تک ان پر کوئی قومی مباحثہ شروع نہیں ہوا۔ مصنف ملک محمد ریاض لکھتے ہیں کہ تینوں تعلیمی اداروں کے لیے جو ایک کروڑ 8 لاکھ 11 ہزار 600 روپے طے ہوئے، اس عدد تک پہنچنے کے کوئی ٹھوس جواز یا دستاویزات موجود نہیں۔ ہاتھ سے لکھا ایک صفحے پر مشتمل غیر دستخط شدہ گوشوارہ ان کو دکھایا گیا جس کی رُو سے ہر یونیورسٹی کے حصہ میں مذکورہ رقم بنتی تھی۔ حالاں کہ بادی النظر میں قائداعظم کی جائیداد کی مالیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

علاوہ ازیں، ملک محمد ریاض اس بات سے بھی اختلاف کرتے ہیں کہ جامعہ بمبئی نے قائداعظم کے ترکہ میں سے 50 ہزار روپے لینے سے انکار کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ یونیورسٹی نے قائداعظم کے نام پر کوئی شعبہ، عمارت یا چیئر موسوم کرنے سے انکار کیا تھا، لیکن غیر مشروط طور پر 50 ہزار روپے یونیورسٹی کے عمومی فنڈ میں ڈالے جانے پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ ملک صاحب یہ بھی رقم طراز ہیں کہ عربی کالج دہلی اور انجمن اسلام سکول بمبئی کو اپنے حصے کے 25 ہزار روپے آج تک نہیں مل سکے۔

یہ تمام متنازع حقائق مزید تحقیق کے متقاضی ہیں۔ موجودہ کتاب دستیاب شواہد و دستاویز کی روشنی میں قائداعظم کے اثاثہ جات کے بارے میں ایک جامع اور مستند تفصیل

فراہم کرنے کی سعی تھی۔ تاہم بہت سے معاملات حل طلب نکلے، لہٰذا علمی دیانت کا تقاضا تھا کہ یہ اختلافاتِ رائے بھی قارئین کے سامنے رکھے جائیں تاکہ وہ سچ کے بارے میں اپنے ذہن سے فیصلہ کر لیں۔ پس اگر ہماری یہ تحقیق تمام حقائق کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہ بھی ہو سکی تو کم از کم مستقبل کے محققین اور مؤرخین کے لیے سمت کا تعین کرنے میں ضرور معاون ثابت ہوگی۔

قصہ مختصر، قائداعظم کی جائیداد کا کُل حساب آج بھی حل طلب ہے۔ کبھی 2001ء میں ہائی کورٹ نوٹس لیتی ہے، کبھی 2010ء میں ڈائریکٹر جنرل ایل ڈی اے نوٹس لیتا ہے۔ کبھی 2019ء میں اینٹی کرپشن والے تفتیش شروع کرتے ہیں کہ قائداعظم کی جائیداد میں خرد برد ہوئی، یا ان کی زمین پہ قبضہ مافیا براجمان ہے وغیرہ۔ ثبوت کسی کے پاس نہیں۔ بات ہر کوئی کر سکتا ہے۔ کاش من حیث القوم ہم اپنی تاریخ کو یاد رکھ سکتے!

کتاب مکمل کرنے سے پہلے میں جُمہوری پبلیکیشنز کے بانی اور معروف مصنف جناب فرخ سہیل گوئندی اور اپنے ہمدرد دوست فوز خالد خان کے گراں قدر مشوروں پر اس حرفِ آخر میں قائداعظم کی رہائش کی چار مزید جگہوں کی نشان دہی کرنا چاہوں گا، جہاں قائداعظم کرایہ دار کے طور پر رہے۔ ان میں برطانیہ میں دورِ طالب علمی کے دو مکان شامل ہیں جہاں کمرہ طویل المدتی کرائے پر لیا گیا اور پاکستان کے دو ہوٹل شامل ہیں جہاں آپ اپنی آمد پر سویٹ میں عارضی قیام فرمایا کرتے تھے۔

پہلا پتہ، مکان نمبر 40 گلیزبری روڈ (Glazbury Road)، ویسٹ کینگسٹن، لندن کا ہے جہاں اعلیٰ تعلیم کی خاطر برطانیہ پہنچنے پر قائداعظم کا قیام بطور Paying Guest رہا۔ اس کا کرایہ 10 پونڈ ماہانہ تھا۔ پھر قائداعظم کے والد کا کاروبار دیوالیہ ہونے پر قائداعظم کو مالی تنگی آئی۔ آپ نے قریب ہی ایک سستے مکان میں منتقل ہوئے جہاں کرایہ کافی کم تھا۔

چنانچہ برطانیہ میں ریکارڈ پر دوسرا پتہ 35 رسل روڈ (Russel Road)، لندن تھا، جہاں ہفتہ وار کرایہ فقط 1 پونڈ 10 شیلنگ یعنی 6 پونڈ ماہانہ تھا۔ یہیں آپ کی مالک

مکان Mrs. F. E. Page Drake تھی۔ قائداعظم کا 35 رسل روڈ والا پتہ ان کے سوانح نگار ہیکٹر بولتھو نے 1952ء میں لندن کی برٹش میوزیم لائبریری میں قائداعظم کی 1893ء کی ایک درخواست جس میں انہوں نے وہاں مطالعے کی اجازت طلب کی تھی، پر چسپاں ایک رسیدی ٹکٹ سے معلوم کیا، جس پر قائد کا مذکورہ پتہ درج تھا۔

بلدیہ لندن نے 1955ء میں مکان کے باہر نیلی تختی آویزاں کردی کہ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح نے یہاں قیام فرمایا تھا۔ اس طرح کی نیلی تختیاں شہر لندن کی 700 دیگر عمارات پر بھی نصب ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ 13 کمروں پر مشتمل یہ تین منزلہ مکان 1989ء میں پاکستانی نژاد جاوید خان نے خرید لیا۔ پھر 2002ء میں اس کو دوبارہ فروخت پر لگا دیا گیا۔ راقم الحروف کو کیمرج یونیورسٹی لندن میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں 35 رسل روڈ اور 40 گلیزبری روڈ دونوں کے دیدار کا موقع ملا۔

اب آخر میں قائداعظم سے وابستہ دو اور قیام گاہوں کا ذکر کرتے ہیں جو پاکستان میں تاریخ فراموشی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ 1880ء میں اطالوی شہری گیوانی فلیٹی نے لاہور میں ایک مہنگا اور معیاری ہوٹل اپنے نام سے بنایا جو پنجاب اسمبلی کے عقب میں کوپر روڈ پر فلیٹیز ہوٹل (Falettis's Hotel) کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ اس کے 8، 10 سال بعد ایک انگریز چارلس فلیش مین نے راولپنڈی میں 17 مال روڈ پر ایک ایسا ہی اعلیٰ ہوٹل فلیش مینز (Flashman's Hotel) اپنے نام سے بنایا۔ انگریز اور ہندوستانی اشرافیہ، لاہور اور راولپنڈی میں انہی دونوں ہوٹلوں میں قیام کرتے تھے۔

1917ء میں چکوال کے موہن سنگھ اوبی رائے نامی شخص نے یہ دونوں ہوٹل خرید لیے جو کبھی اوّل الذکر ہوٹل میں ملازم ہوا کرتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اوبی رائے دو مزید ہوٹلوں، سیسل ہوٹل (Cecil Hotel) مری اور ڈینز ہوٹل (Dean's Hotel) پشاور کا بھی مالک بن گیا اور ان چاروں ہوٹلوں کو ایسوسی ایٹڈ ہوٹلز آف پاکستان (AHP) نامی کمپنی کے تحت رجسٹر کروالیا۔ 1950ء کی دہائی میں وہ بھارت نقل مکانی کر گیا

اور وہاں Oberoi Hotels کے نام سے ہوٹل کی صنعت میں بہت نام کمایا۔ اس کے بھارت میں موجود ہوٹل ایسوسی ایٹڈ ہوٹلز انڈیا (AHI) کہلاتے تھے۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں حکومتِ پاکستان نے AHP کے چاروں ہوٹل بطور دشمن کی ملکیت (Enemy Property) اپنی تحویل میں لے لیے اور 1976ء میں بھٹو حکومت نے پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (PTDC) کے انتظام وانصرام میں دے دیئے۔ اگلے 25 سال یہ ہوٹل PTDC کی ملکیت میں رہے اور خسارے کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ گئے، تب سرکار نے ان کی نجکاری کا فیصلہ کر ڈالا۔ چنانچہ 3 ہوٹل پرائیویٹائز ہو گئے مگر راولپنڈی والا بچ گیا۔

بہرحال قائداعظم جب بھی لاہور تشریف لاتے تو فلیٹیز ہوٹل میں ہی قیام فرماتے۔ 14 جولائی 1929ء کو آپ غازی علم الدین کے مقدمے کی پیروی کے لیے لاہور تشریف لائے تو یہیں سوئٹ نمبر 18 میں قیام فرمایا۔ 2000ء میں ہوٹل کی نجکاری ہوئی تو پھر ہوٹل برسوں بند رہا۔ پھر نئے مالکان نے، مرمت اور تزئین نو کے بعد ہوٹل 2012ء میں دوبارہ کھول دیا اور اس کو نیا سوئٹ نمبر 101 دے کر پرانی طرز کے فرنیچر وغیرہ سے آراستہ کر دیا۔ اَب یہ قائداعظم سوئٹ کہلاتی ہے اور 35 ہزار روپے یومیہ کرایہ پر ہوٹل کا مہنگا ترین کمرا ہے، یعنی پرائیویٹ مالکان نے قائداعظم کے نام کو بھی پیسہ کمانے کا ذریعہ بنالیا۔

اب آتے ہیں دوسرے ہوٹل کی طرف جو PTDC کی ملکیت رہا۔ قائداعظم محمد علی جناح اور بیگم جناح نے 1926ء میں وادیٔ کشمیر کے سفر کے دوران راولپنڈی کے فلیش مینز ہوٹل میں قیام فرمایا، تاہم تاریخ اور کمرہ نمبر معلوم نہ ہو سکا۔ تاہم قائداعظم نے وادیٔ کشمیر کا تیسرا اور آخری دورہ 1944ء میں کیا جس کی تفصیلات بہت سی کتابوں میں ہیں۔ سری نگر سے واپسی پر آپ نے راولپنڈی کی ضلعی مسلم لیگ کی درخواست پر اس شہر میں رکنے کا فیصلہ فرمایا۔ مورخہ 26 جولائی 1944ء کو آپ براستہ مری، جونہی راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوئے تو ایک بہت بڑا استقبالی جلوس فیض آباد چوک پر موجود تھا جس کے

جلو میں مری روڈ، جامع مسجد روڈ اور راجہ بازار سے ہوتے ہوئے آپ فلیش میز ہوٹل میں پہنچے جہاں آپ کا قیام سوئٹ نمبر 3 میں تھا۔ آپ نے اگلی صبح 27 جولائی کو اسی ہوٹل کے صحن میں مسلم لیگ یوتھ ونگ کے نوجوانوں سے ملاقات کی اور پھر انجمن فیض الاسلام کا دورہ کیا۔ فلیش میز ہوٹل کی سوئٹ نمبر 3 محفوظ نہ کی گئی۔ بدقسمتی سے تعمیر نو میں پرانی عمارت ڈھا دی گئی۔ تاہم موجودہ انیکسی اسی جگہ پر تعمیر ہے جہاں قائداعظم کے زیر استعمال کمرہ واقع تھا۔ اب یہ کمرہ نمبر 99 کہلاتا ہے۔

پاکستان ٹورازم ڈویلپمنٹ کارپوریشن (PTDC) نے قائداعظم انیکسی سے پیسہ کمانا تو درکنار اس کمرے کا خیال رکھنا یا اسے محفوظ بنانا بھی اپنے شایانِ شان نہ سمجھا۔ اس کے وہ 56 ملازمین جن کی زندگی اسی ہوٹل میں گزری اور رزق اسی ہوٹل سے مشروط تھا، راقم الحروف کے ان سے انٹرویوز کے دوران اُن میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ قائداعظم کبھی اسی ہوٹل میں تشریف لائے تھے۔

پی ٹی ڈی سی کے ملازمین کی یونین مضبوط ہوتی چلی گئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ ڈرائیور کی تنخواہ ایک لاکھ 22 ہزار روپے ماہانہ اور خاکروب کو 78 ہزار روپے ماہانہ ادا ہونے لگے۔ یہ دونوں تنخواہیں اس وقت کے صوبائی سیکریٹری سیاحت کی تنخواہ سے بھی زیادہ تھیں۔ یونین کی پشت پناہی کی وجہ سے کام کا رواج تھا ہی نہیں، کمرے خراب ہونے لگے اور ملازمین کی چاندی ہوتی رہی۔ مال روڈ کے مہنگے ترین سنگم پر 10 ایکڑ سے زائد قیمتی اراضی پر 44 کمروں کا Occupancy Rate، 78 فیصد رہتا تھا۔ اگر یہ صد فیصد تک بھی پہنچ جاتا تو 56 ملازمین کی سالانہ 8 کروڑ 40 لاکھ تنخواہ کی وجہ سے سالانہ خسارہ 4 کروڑ سے زیادہ ہی رہنا تھا جو پاکستانی ٹیکس دہندگان پر ایک بوجھ بلکہ ڈکیتی تھا۔ 2018ء کے بعد تحریک انصاف حکومت اس خسارہ کی وجہ سے AHP کی اس آخری بچی جائیداد کی نجکاری پر سوچ بچار کرنے لگی۔ یہ صفحات لکھتے ہوئے راقم الحروف کا سر لکھائی کی وجہ سے کم اور شرمندگی کی وجہ سے زیادہ جھکا ہوا ہے کہ قائداعظم سے وابستہ قیام گاہوں سے منسلک ہر شخص نے کیسے ذاتی مفاد اٹھایا اور پیسہ حاصل کیا۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ راقم الحروف، بمبئی کے اپالو ہوٹل جہاں قائداعظم نے 1897ء تا 1900ء تین سال قیام کیا اور پیرس کے شاہ جارج پنجم ہوٹل جہاں 1928ء میں قائداعظم نے اپنی اہلیہ کے علاج کے دوران پانچ ماہ قیام کیا، اپنے قائد کے نقشِ پا تلاش کرتے بمبئی اور پیرس بھی پہنچا۔ یہ دونوں ہوٹل آج بھی کھڑے ہیں، لیکن قائداعظم سے وابستہ کوئی شے محفوظ نہیں۔ اپنوں نے خیال نہ رکھا تو غیروں سے کیا گلہ؟؟؟

کتابیات

انگریزی حوالہ جات

A A Ravoof , "Meet Mr. Jinnah", Madrass: Deccan Times Press, 1944

Ajeet Javed , "Secular and Nationalist Jinnah" , Karachi: OUP, 2009

Akbar S. Ahmad , "Jinnah, Pakistan and Islamic Identity" , London: Routledge , 1992

Fatima Jinnah , "My Brother" , Karachi: Quaid-e-Azam Academy, 1987

Fazal Haque Qureshi , "Every Day with Quaid-e-Azam" , Karachi: Ashraf Co. 1976

Hector Bolitho, "Jinnah: Creator of Pakistan" London: John Murray, 1954

Ian Bryant Wells , "Jinnah's Early Politics: Ambassador of Hindy-Muslim Unity", Delhi: Paramount Books, 2005

Khwaja Razi Haider , "Ruttie Jinnah, The Story Told and Untold" , Karachi: Pakistan Study Center, 2004

Riaz Ahmad ,"Quaid-e-Azam: The Formative Years" , Islamabad: NIHCR, 1986

Saad S. Khan, "Ruttie Jinnah: The Woman who stood Defiant", Gurgaon: Penguin Press, 2020

Shagufta Yasmeen , "Ruttie Jinnah: Life and Love" , Karachi: Royal Books Co. 1996

Sheela Reddy , "Mr. and Mrs. Jinnah : The Marriage That Shook India", Gurgaon: Penguin , 2017

Stanley Wolpert , "Jinnah of Pakistan", New York: Oxford University Press, 1984

Syed Shamsul Haque , "Plan Mr. Jinnah" , Karachi: Royal Book Co. 1971

اردو حوالہ جات

(1) آفتاب احمد، ''قائدِاعظم؛ چند یادیں، چند ملاقاتیں''، (لاہور، 1976ء)

(2) ڈاکٹر سعد خان، ''قائداعظم کی نجی زندگی''، (لاہور، بک ہوم، 2020ء)

(3) سید عالم محمود، ''رتی جناح، فرانس سے لکھا گیا یادگار خط''، اردو ڈائجسٹ، ستمبر 2012ء

(4) شائستہ سہروردی اکرام اللہ، ''منتخب تحریریں''، مرتبہ احمد سلیم، (کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2007ء)

(5) شہاب الدین دسنوی، ''جناح، رتی اور میں''، (کراچی، ورثہ پبلشرز، 2011ء)

(6) عقیل عباس جعفری، ''قائدِاعظم کی ازدواجی زندگی''، (کراچی، ورثہ پبلشرز، 2010ء)

(7) قاضی عدیل عباسی، ''تحریکِ خلافت''، (لاہور، جمہوری پبلشرز، 2009ء)

(8) مولانا حسین احمد مدنی، ''سول میرج اور لیگ''، (دہلی، جمعیت العلماء، 1936ء)

(9) خالد احمد، ''قائداعظم کے خاندانی تنازعے''، (کراچی، پرنٹ لائن، 2000ء)

(10) ملک محمد ریاض، ''قائداعظم کی جائیداد اور سرمایہ کاری''، (کراچی، سٹیٹ بینک آف پاکستان، 2008ء)

کتاب کے لیے تفصیلی انٹرویوز

(1) پروفیسر شریف المجاہد (کراچی) مشہور سکالر اور مؤرخ

(2) پروفیسر عائشہ جلال (Tufts University) امریکہ، مشہور سکالر اور مؤرخ

(3) شیلا ریڈی (نئی دہلی)، مصنفہ، نامور صحافی اور سوانح نگار

(4) یوسف موچھلا (ممبئی)، نامور قانون دان، مہاراشٹر اہائی کورٹ میں جناح خاندان کے وکیل

(5) لیاقت حبیب مرچنٹ (کراچی)، قائدِاعظم کے بھانجے، ماہر قانون اور جناح ٹرسٹ کے چیئرمین

(6) بیرسٹر عدنان صبور روہیلہ، (اسلام آباد)، نامور قانون دان، روٹری (Rotary) پاکستان کے نامزد گورنر

(7) عقیل عباس جعفری (کراچی)، سکالر، محقق اور مصنف

ACC. # 21488
MADAR-I-MILLAT LIBRARY
AIWAN-I-QUAID-I-AZAM
MAZARIA-I-PAKISTAN TRUST